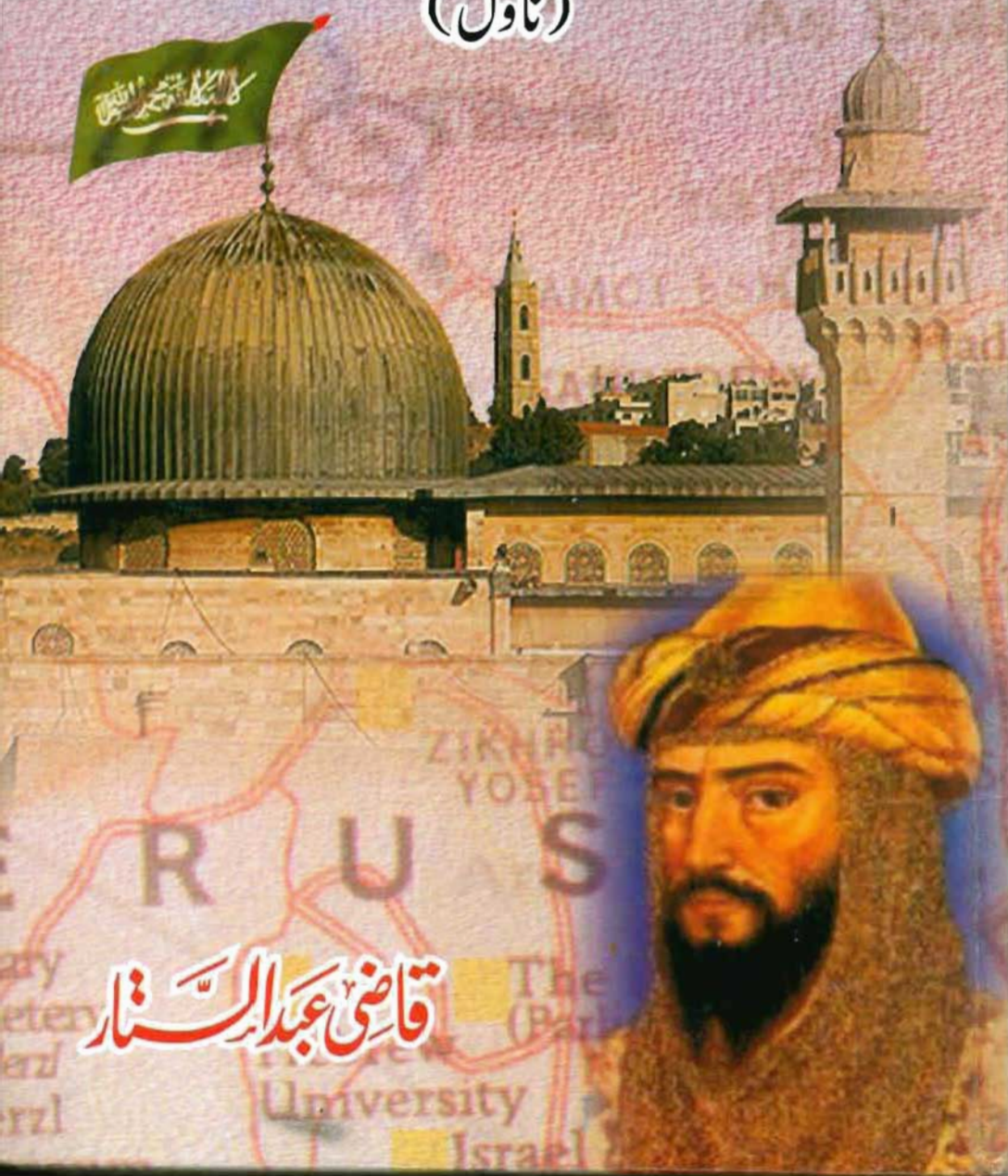


صلاح الدین ایوبی

(ناول)



صلاح الدین ایوبی

(ناول)

قاضی عبدالستار

ایجویشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی

© جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

SALAHUDDIN AYYUBI

(Novel)

by

QAZI ABDUL SATTAR

Year of Edition 2008

ISBN 81-8223-345-3

Price Rs. 140/-

صلاح الدین ایوبی (ناول)

قاضی عبدالستار

۲۰۰۸ء

۱۴۰ روپے

عقیف آف سیٹ پرنٹرس، دہلی

نام کتاب

مصنف

سن اشاعت

قیمت

مطبع

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)

Ph: 23216162, 23214465 Fax: 0091-11-23211540

E-mail: info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com

Website: www.ephbooks.com



ہر زمانے میں ایک آدھ شہر ایسا بھی ہوتا ہے جس کے ابروئے سیاست کی ایک شکن تاریخ عالم میں زلزلے ڈال دیتی ہے۔ خرقہ پھیل کا دمشق، بنی امیہ کا دمشق اور بادشاہوں کے بادشاہ صلاح الدین کا دمشق ایسا ہی ایک شہر تھا۔ اسی جلیل المرتبت شہر کو روما کے شہریار قیصر جولیان نے ”چشم مشرق“ کہا تھا، یونان نے ”سب سے حسین شہر“ کا خطاب دیا تھا، عربوں نے ”عروس کائنات“ کی خلعت پہنائی تھی اور اسی کے سر پر ”باغ عالم“ کا تاج رکھا تھا۔ اسی دمشق کی اندرونی شہر پناہ اس کے سامنے تھی جس میں سیاہ اور زرد رنگ کے مدور، مکعب اور مثلث پتھر اس طرح جڑے ہوئے تھے جیسے کالے ٹھل پر پتھر اراج ٹانک دیئے گئے ہوں اور اس کا خچر ”باب الفتح“ سے داخل ہونے والے ہجوم میں بہہ گیا۔ وہ سینے تک لگام کھینچے، سانس روکے آدمیوں کے اس سمندر میں تنکے کی طرح لرز رہا تھا جس کی موج موج میں دنیا کے ہر رنگ، ہر قوم اور ہر مذہب کے ماننے والے موجود تھے۔ ان میں تاجر تھے جو روئے زمین کی نعمتوں کو دمشق کا بازار دکھلانے لائے تھے۔ طالب علم تھے جو مدرسہ ایوبی کے جید عالموں کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے آئے تھے۔ سپاہی تھے جو ”فاتحوں کے فاتح“ سے اپنی تلواروں کے جوہر کی داد لینے آئے تھے۔ سفیر تھے جو ملکوں ملکوں کے بادشاہوں کا نذرانہ عقیدت لائے تھے اور سیاح تھے جو اپنے عہد کی تاریخ کے سب سے بڑے مرکز کو سلام کرنے آئے تھے۔ اب بنی امیہ کی عظیم الشان مسجد کا روکار سامنے تھا۔ وہ اس کا جاہ و جلال دیکھتا ہوا اس کی پشت کے بازار میں آگیا اور ایک چیختے چلا تے حتام کے سامنے اپنا خچر روک لیا۔ ایک غلام نے لپک کر اس کے ہاتھ سے لگام جھپٹ لی اور وہ سرخ پتھر کے منش چبوترے کے قالین پر پھیلے ہوئے مالک حمام کے سامنے کھڑا ہو گیا کہ شاید وہ اسے بیالیں

برس بعد پہچان لے لیکن مالک کے سپاٹ چرے اور خالی آنکھوں کو دیکھ کر وہ اندر گھس گیا۔ نہادھو کر جب ذرا جی ٹھکانے ہوا تو اس نے چاہا کہ اس سخت فیصل سے دھول دھپا کرے اور بیالیس برس قبل کے ان واقعات کو زندہ کرے جو ہزاروں من یادوں کے نیچے دبے پڑے تھے لیکن اپنی خفیہ سفارت کی نزاکت کا خیال کر کے باز رہا اور ناف تک پھیلی ہوئی آنکس کی صلیب پر اپنا دھنا ہاتھ رکھ کر سڑھیاں اتر اور شہوت کی چھاؤں میں بیٹھے نارگیلی پیتے ہوئے غلام سے لگام لے کر خچر پر سوار ہو گیا۔

حدنگاہ تک بزمِ فحل و سحاب کے ہزار ہا تھان کھلے پڑے تھے۔ اُن پر جگہ جگہ رنگین پھولوں کے اصفہانی قائلین بچھے تھے۔ اُن پر چلنے کی لذت کا احساس خچر کے علاوہ اس کو بھی ہو رہا تھا۔ کھجوروں کے فلک بوس درختوں کے جھنڈے نکلتے ہی قصرِ سلطانی کا روکار نظر آیا جس کے سب سے بلند محراب کے تپے کے کلس پر وہ زرد پرچم لہرا رہا تھا جس کے سائے نے مشرق و مغرب کے بڑے بڑے مفرد شہنشاہوں کو سرنگوں دیکھا تھا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ سواری سے بچاند پڑا۔ ایک ہزار ترکانوں کا ذاتی محافظ رسالہ سنہرے ساز و دیراق سے آراستہ، سفید عربی گھوڑوں پر سوار سفید حریر کے کفتان اور زرد طربوش پہنے، طلائی کمر بندوں میں مرصع قبضوں کی ہلالی تلواریں اور خنجر لگائے کاندھوں پر زرد بیرقیں اٹھائے کھڑا تھا۔ دور دہانے بازو کے سائے سجے ہوئے کوئل گھوڑوں کا ہجوم تھا۔ دفعتاً ایک سوار گھوڑا اڑا کر اس کے سائے آگیا۔ اس نے سینے پر صلیب بنائی اور گریبان سے ملک العادل کا پروانہ راہ داری نکال کر سوار کے حوالے کر دیا۔ وہ اسے دھیں روک کر واپس ہو گیا۔ قراقرش (افسر رسالہ) کی جنبش سر کے بعد اسے بڑھنے کی اجازت نصیب ہوئی۔ محراب کے سائے سنگ سیاہ کی چوکی پر بیٹھ کر وہ اس بلند آہنی دروازے کو دیکھنے لگا جس پر سونے کے پانی کی بلیں بنی تھیں اور چاندی کے پھول چڑھے تھے۔ پھر لائے چوڑے سیاہ فام سوڈانی غلاموں کا دستہ اسے اپنے گھیرے میں لے کر چلا جو سرخ جالیگہ اور نیلے پھل والی تلواریں پہنے تھے۔ چوڑی روش پر سرخ پتھر چڑھے تھے جس کے دونوں طرف دمشق کے مشہور عالم گلابوں کی جھاڑیاں کھڑی تھیں۔ ہر طرف سبزہ بچھا تھا، کہیں کہیں کھجوروں کے درخت، ترخ کے جھنڈ، خوبانی کے گردہ اور نارنج کے غولی مودب کھڑے ہوئے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ایک طرف

کوشکوں میں شکاری چیتوں کی قطار زرد چشم پوش پہنے ریشمی رسیوں میں بندھی کھڑی تھی۔ دوسری طرف مرمر میں دالانوں میں خاصے کے سپاہی زرد کرتیاں اور سیاہ جامے پہنے کاندھوں پر خاردار گرز دھرے کمر میں چوڑے چوڑے تیغے باندھے کھڑے تھے۔ ان کے سامنے سبزے پر سنہرے عقابوں، بازوں اور شکروں کے چوڑے ٹہلے رہے تھے۔ پھر ایک طرف سے سپاہیوں کی قطار طلوع ہوئی۔ اس نے غلاموں کو واپس کر دیا اور اسے اپنی تحویل میں لے لیا۔ ان کے زرد جنوں کی آستینوں، گریبانوں اور داموں پر چاندی کے تاروں کا کام تھا۔ چینی اطلس کے زرد عماموں پر شتر مرغ کے پر لگے تھے۔ کمر میں بالشت بالشت بھر چوڑی سونے کی پیٹیاں تھیں اور سونے سونے سیاہ ہاتھوں میں چاندی کا دہ "عصا" پکڑے ہوئے تھے جن کے سروں پر سونے کے ہلال جڑے تھے۔ سامنے نیزے کے برابر انچاس گز لمبا اور چپاس گز چوڑا سنگ سیاہ کا چنگیلا چوڑہ تھا جس کے چاروں طرف خوشبودار پانی کی نہر کی گوٹ لگی تھی۔ چوڑے پر سنگ مرمر کا وسیع حوض تھا جس کے حاشیے پر چینی کنیزوں کی سبک ٹانگوں کی طرح زرد پتھر کے ترشے ہوئے ستون نصب تھے۔ ان پر سونے کی مہین فلکاری جگمگا رہی تھی جیسے ٹانگوں پر روئیں چمک رہے ہوں۔ ان ستونوں پر تہہ رکھا ہوا تھا گویا ہوا میں معلق ہوئے تھے۔ تپے کے چاروں طرف سنگ مرمر کی جالیوں سے مزین شیشیں تھیں جو سنگ سیاہ کے چوڑے کے آئینے میں اپنی آرائش دکھ رہی تھیں۔ حوض میں قیمتی پتھروں کی سی رنگ برنگ مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ اس کے قلب میں سونے کا بھاری نوارہ متانت سے اڑ رہا تھا۔ ہر ستون کے سامنے ایک خاص بردارنگی تلواریں علم کے مطلق و متعجب مجسموں کے مانند جما ہوا تھا۔ تپے پر جانے والے زینے کے کھلے ہوئے چاندی کے دروازے پر کیفا کا مشہور ارتقی فرمانروا نور الدین زرد کفتان اور طربوش پہنے کمر میں صرف ایک جڑاؤ خنجر لگائے حاجب بنا کھڑا تھا۔ پادری نے زمین کو چھوتا ہوا سلام کیا۔ حاجب بارگاہ نے ابرو کو جنبش دی۔ پادری آہستہ آہستہ کاشانی فحل سے منڈھی ہوئی سڑھیاں چڑھنے لگا۔ آخری سڑھی پر مساح غلاموں نے پادری کا بازو پکڑ لیا اور خطا کا بیش قیمت پردہ ہٹا کر اسے تپے میں داخل کر دیا۔

سارا فرش سبز پتھر کا تھا جس پر سفید چٹکی کاری اور سنگ مرمر کی آبدار دیواروں پر سیپ کی خاتم بندی تھی۔ نازک گل بوٹوں کے حاشیوں کے درمیان "اقوال زرتیں" کندہ

تھے۔ تھوڑی تھوڑی دور پر قد آدم محرابوں میں نازک ترین جالیوں کے پردے لگے تھے۔ بیضی طاقتوں میں جھگڑاتی ہوئی زریں انگوٹھیوں میں عود و عنبر سلگ رہا تھا۔ مغربی دیوار کے نیچے سنگ سمان کا تخت بچھا تھا جس کے پائے سونے کے کام سے زرد تھے۔ چڑے کے گدے پر شیر کی کھال بچھائے بھاری گاؤنیکے سے پشت لگائے بادشاہوں کا بادشاہ نیم دراز تھا۔ ان کے گھٹنوں پر کٹھنیری شال پڑی تھی جس سے ان کا سفید پانجام جھانک رہا تھا۔ زرد کفنان کے گریبان اور چوڑی چمکی آستین سے حریر کی صدری کے نیکے اور کف نظر آرہے تھے۔ داہنے ہاتھ کی انگلی میں وہ انگوٹھی تھی جسے یورپ کے سفیر ”نور کا پہاڑ“ کہتے تھے۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں، دہانہ تنگ، ہونٹ پتلے اور دانت سفید تھے۔ کشادہ پیشانی کے وسط سے اونچی ناک کی جڑ کے پاس تک زخم کا وہ نشان تھا جسے سلطان اعظم نے حطین کی لڑائی میں قبول کیا تھا اور جس پر بالوں کی ایک سفید لٹ سجدہ کر رہی تھی۔ سیاہ گھنے دور دور بیٹھے ابروؤں کے نیچے بے پناہ آنکھیں اس بڑھاپے میں بھی زندگی کے منصوبوں اور عزائم کی آگ سے دھک رہی تھیں۔ سفید پتلی اور نوک دار داڑھی نے فرشتوں کا تجل پیدا کر دیا تھا۔ تخت کے پہلو میں ہاتھی دانت کی تپائی پر وہ طربوش رکھا ہوا تھا جس نے تاریخ عالم کی عظیم الشان لڑائیوں کی کڑی دھوپ سہی تھی۔ تخت کی پشت پر دیوار میں ”نصر من اللہ وفتح قریب“ کے زریں طغریے کے نیچے سونے کی کھوئی میں چڑے کا معمولی نیام پہنے وہ تلوار لٹک رہی تھی جس کی شکست کے لئے ساری دنیا کے گرجوں میں سالہا سال تک لاکھوں انسانوں نے ہزاروں من آنسوؤں سے دھوئی ہوئی دعائیں مانگی تھیں۔ سلطان اعظم کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ قدموں کی چاپ پر نگاہ اٹھائی۔ پادری گھٹنوں پر گر گیا۔ اشارہ پاتے ہی خدمت گزاروں نے پادری کو کھلوں کی طرح اٹھا کر تخت کے نیچے بچھے ہوئے سفید قالین پر رکھ دیا۔ جب ہوش بجا ہوئے تو اس نے آنکھیں اٹھائیں۔ شبنم کی طرح نرم سلطانی نگاہ اس کا چہرہ پڑھ رہی تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے اپنی اصلیت اتاری اور اس کے اوپر کا حصہ بکڑ کر پوری طاقت سے زور کیا۔ صلیب کھل گئی۔ خول سے ایک موم جامہ نکال کر آنکھوں سے لگایا اور دونوں ہاتھوں پر رکھ کر گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ حاجب نے اٹھالیا اور چاکہ مہر توڑ دے۔ پادری نے ہکلاتے ہوئے گزارش کی۔

”میری استدعا ہے کہ اسے سلطان اعظم کے دست مبارک میں دے دیا جائے۔“ سلطان کی نظریں دکھ کر حاجب نے اسے سلطان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ سلطان نے مہر دیکھی، نگاہ مطمئن ہو گئی۔ کفنان کی آستین سے چھوٹا سا خنجر نکالا اور اس کے نیلے پھل سے لفافہ چاک کر کے خط نکال کر سرکاری انداز میں پڑھا۔ پھر پادری کو دیکھا جس نے نگاہ جھکائی۔ وہ خط نیکے پر ڈال کر زرد نگار چھت میں جھولتے ہوئے بھاری فانوس کے نقش و نگار میں کھو گئے۔ تھوڑی دیر بعد نظریں نیچی کیں۔ فرمان کے منتظر حاجب کو دیکھ کر گردن ہلا دی۔ وہ پادری کو لے کر آرام خانہ خاص کے باہر چلا گیا۔ وہ اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھے رہے۔ پھر تالی بجائی۔ مرصع غلاموں کا ایک دستہ بے آواز قدموں سے آ کر حکم کا انتظار کرنے لگا۔ سلطان نے ان کی طرف دیکھے بغیر اشارہ کیا۔

”آج کی حضریاں موتوں کی گئیں۔“

دستہ الٹے پیروں واپس ہو گیا۔ سارے وقت آنکھیں سوچتی رہیں۔ دل کا پوجا ہوا ایک زخم ہرا ہوا گیا جس کی خوشبو سے پوری شخصیت معطر ہو گئی۔ ظہر اور عصر کی نماز تہا پڑھی گئی۔ مغرب کے وقت زینے کے پردے کے پیچھے ہتھیاروں کی مدھم جنبش اور دہلی دہلی سرگوشیوں کے پس منظر میں شہزادہ نصر کی ضدی چونچال اور مودبانہ آواز کھنکنے لگی۔ ملک العزیز کے اس بیٹے کو سلطان بہت عزیز رکھتے تھے۔ اجازت پا کر شہزادہ نصر کے داخل ہوتے ہی سلطان کا چھوٹا بیٹا ملک الظاہر اپنی دنیا کے سب سے بڑے حکیم میسوس کو لے کر داخل ہوا۔ حکیم لاجبی داڑھی پر خلفائے عباسیہ کا درباری جبہ پہنے اندر آئے جس کے سیاہ گھیر دار داسن ٹخنوں پر لرز رہے تھے اور دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ سلطان نے کلائی بڑھائی، حکیم نے کفنان کی سوتی آستین الٹ دی اور نبض دیکھنے لگے۔ پھر مراقبے سے نکل کر ملک الظاہر کو سرت سے دیکھا گویا سلطان کی تندرستی پر مبارکباد دے رہے ہوں۔ خادم کے ہاتھوں سے سنہرے طشت سے وہ گلاس اٹھالیا جس پر سونے کے پانی سے قرآن پاک کی آیتیں لکھی ہوئی تھیں۔ کچھ پڑھا، سر پوش اٹھا کر گلاس پر دم کیا اور پتھلی پر رکھ کر کروغ میں چلے گئے سلطان نے بے نیازی سے گلاس اٹھا کر لبوں سے لگایا اور میسوس دونوں ہاتھ پھیلا کر خدا سے عالم اسلام کے سب سے بڑے محسن کی زندگی کی دعا مانگنے لگے۔ اتنی دیر میں غلاموں نے ایک

ایک جھاڑ، ایک ایک فانوس روشن کر دیا۔ میوس کے ساتھ ہی ملک الظاہر بھی واپس آ گئے۔ شہزادہ نصر اور لیٹنار ہتا لیکن وضو کے لئے آبدار خانہ جاتے ہوئے غلاموں کو اشارے میں مگر دے گئے جو شہزادہ کو بہلا پھسلا کر گھسیٹ لے گئے۔ نماز کی مرمریں چوکی پر کھڑے ہوئے ہی حکم دیا۔

”نہ خدا کی خواہش ہے اور نہ کسی کو داغ کی اجازت۔“

نماز کے بعد دیر تک وہ مصلے پر بیٹھے رہے۔ عدنان کے موتیوں کی تسبیح ان کی گندمی خرزوٹی انگلیوں میں لرزتی رہی یہاں تک کہ قصر معلیٰ کی مسجد کے مؤذن نے عشاء کی اذان دے دی۔ وہ پھر نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔ جب اٹھے تو نیچے پہرہ تبدیل ہو رہا تھا۔ آوازیں ہونٹوں پر انگلی رکھے چبوترے پر ریگ رہی تھیں۔ وہ تخت پر گاؤ نیکی کے سہارے بیٹھ گئے اور پادری کا لایا ہوا خط نکال کر دوبارہ پڑھا۔ یہ رات ان کی زندگی کی سب سے بھاری رات تھی۔ ان کے گھنگھور شباب نے ۱۱۵۲ء کی وہ بھیا تک رات بھی دیکھی تھی جب فرانس کی ملکہ نے دین مسیح کی دعوت ٹھکرا دیئے پر انھیں اپنی دائمی جدائی کے سمندر میں غرق کر دیا تھا۔ انھیں ابھی دو برس پہلے ۱۲ جولائی ۱۱۹۱ء کی وہ رات بھی یاد تھی جب وہ صاحب فرانس تھے اور کرٹ بدلنے سے معذور تھے اور فرنجیوں نے ان کی شہادت کی خبر اڑا دی تھی اور ملکہ کے بیوقوف اور بزدل امیر نے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور انھوں نے ایمان کی حرارت میں بکتر چہن لیا تھا اور وہ اہلن گھوڑا طلب کر لیا تھا جس کی چال سے گردش ایام نے چلن سیکھا تھا اور چاہا تھا کہ پچاس ہزار سواروں سے یورپ کی پانچ سلطنتوں کی چار لاکھ فوج پر جا پڑیں اور اسلام کی آبرو پر بچھاو ہو جائیں لیکن دین کے عالم اور تلوار کے دھنی ندیموں نے رکاب پر سر رکھ دیئے تھے اور پاپوش آنسوؤں سے بھگو دی تھی، لیکن آج کی رات اس رات سے کہیں بھاری تھی۔ اس غم کو بانٹنے کے لئے پچاس ہزار جاں باز مجاہدوں کی گردنیں خم تھیں لیکن اس پہاڑ کا بوجھ تنہا ان کے شانوں پر تھا۔ ان کے ایک اشارے پر ہزاروں ہاتھ اپنی گردنیں قلم کر کے ان کے قدموں میں ڈال سکتے تھے لیکن کوئی ایک آنکھ دو آنسوؤں سے بھی ان کے اس غم میں غم گسار نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ کس قدر تنہا تھے۔ ان کے سر پر کیسی جان لیوا تہائی کی تلوار لٹک رہی تھی۔ انھوں نے ساتویں بار وہ خط پڑھا۔

”اکتا لیس برس پہلے دریائے زرافشاں کے کنارے ہم نے آپ کو الوداع کہا تھا۔ آپ نے جن نظروں سے ہمیں دیکھا تھا وہ نظریں..... فرانس اور انگلستان کے تخت و تاج سے قیمتی نظریں ہمارے ساتھ ساتھ رہتی ہیں۔ زندگی کے کالے کوسوں میں ان نظروں نے ہماری چارہ گری کی ہے، ہماری ہمت بندھائی ہے۔ ہم نے چاہا تھا کہ آپ کو مخاطب کرنے کی جساہت نہ کریں گے لیکن وقت نے مجبور کر دیا۔ وقت جو بڑے بڑے کشور کشاؤں پر بادشاہی کرتا ہے۔ ہمارا رچرڈ، انگلستان کا تاجدار اور آپ کا حلیف، شہنشاہ جرمنی کے بزدلانہ دام میں گرفتار ہے اور اس کا باغی بھائی نائب السلطنت ہے جو حکومت کو ٹرپ کرنے کا منصوبہ بنائے بیٹھا ہے۔ فرانس کا بادشاہ اس خوشی میں جشن منارہا ہے اور ہم بے دست و پا ہیں۔ دل سوختہ، دماغ مختل اور چشم نزار ہے۔ نہ اختیار میں لشکر ہے، نہ قابو میں حکومت۔

اے نائٹوں کے نائٹ تو نے اُن گت ماؤں کو بیٹے، لا تعداد بہنوں کو بھائی اور بے شمار بیویوں کو شوہر عطا کئے ہیں۔ اے شجاعوں کے شجاع..... مشرق سے مغرب تک تیری تلوار کے گیت گائے جاتے ہیں۔ اے بادشاہوں کے بادشاہ یورپ کے ہر کنگرہ سلطانی پر ہم نے تیرے پرچم کی پرچھائیاں دیکھی ہیں۔ ہم کو یقین ہے کہ تیرے لشکر کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی دھمک سے جرمنی کا غرور لرز جائے گا اور رچرڈ کو تاجداروں کے اعزاز کے ساتھ رخصت کیا جائے گا۔

ہم فرانس کی سابق ملکہ، انگلستان کے بادشاہ کی ماں آپ سے اپنے بیٹے اور آپ کے حلیف کو مانگتے ہیں۔

سلطان اعظم کی آنکھیں بند ہو گئیں اور ان کے رخساروں پر دوسو تکی ڈھلک آئے اور وہ خود کلام ہوئے۔

”ہم نے رجب ذی قعدہ نوچ کے سپہ سالار کی طرح کہاں برتا۔ ہم نے اس کی شفا کیوں کو نظر انداز اور گستاخیوں کو برداشت کیا۔ ہم نے اسے افضل اور عزیز کی طرح جانا اور چاہا تھا۔ وہ جب بیمار ہوا تو دمشق سے بغداد تک کے بہترین طبیبوں کی تیمارداری کا حکم صادر کیا گیا۔ فرانس کی عیاری کے خلاف بروقت یادری کی اور جب ہمارے جاں نثاروں نے اس کا گھوڑا قتل کر دیا اور وہ جنگ سلطانی لڑنے لگا تو ہم نے اپنی سواری کا خاص گھوڑا عنایت کیا اور سوار ہونے کی مہلت بھی عطا کی۔ ایلینور..... سپاہی جانتا ہے کہ میدان جنگ کی اس مہلت کا دوسرا نام دوسری زندگی ہوا کرتا ہے۔ مگر.....“

اور سلطان اعظم اپنی بیداری کے خواب سے چونک پڑے۔ ان کی آواز کی گونج سننے ہی حکم بردار شمشیر زادوں سے زینہ بھر گیا۔ انہوں نے بھاری آواز میں تخیلے کا حکم صادر کیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اب یادوں کی آندھی چلنے لگی تھی اور صحیفہ زندگی کے ورق بکھر گئے تھے۔

دوسری صلیبی جنگ کا عہد اور شباب کا زمانہ تھا۔ بدن میں آگ، دل میں حوصلے اور دماغ میں منصوبے بھرے تھے۔ وہ جبل لبنان کی تاریک گھاٹیوں میں گھوڑا دوڑا کر شیر کو ڈھونڈ کر شکار کر چکا تھا۔ ساتھ کے سپاہی چھوٹ چکے تھے اور وہ گھوڑے پر اڑاڑا ان کی جستجو کر رہا تھا۔ جب وہ تلک نما کی اس چوٹی پر پہنچا جہاں سے زرافشاں کے چکیلے کنارے نظر آتے ہیں تو متحیر ہو کر کھڑا رہ گیا۔ دریا کا تمام مغربی کنارہ افرنجی لشکروں سے کھلا پڑا تھا۔ سورج کی گلابی کرنوں میں غضب سے لال زرافشاں کچھ سوچتا ہوا آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا۔ اس نے گھوڑے کو اڑنے لگایا اور چکارے کی طرح طارے بھرتا قیام گاہ پر آیا۔ کچھ ملازم نیچے لا کر دمشق روانہ ہو چکے تھے اور باقی اس کا انتظار کر رہے تھے کہ والد محترم امیر دمشق کا حکم سنائیں۔ اس نے اپنا بار ہوا شیر گیدڑوں کے لئے چھوڑا اور گہرے ہوتے اندھیرے میں دمشق کی طرف باگیں اٹھا دیں۔ آدھی رات ادھر تھی اور آدھی رات ادھر جب وہ شہر میں داخل ہوا تو کوئی مکان ایسا نہ تھا جس کی چھت پر آدمیوں کی ٹولیاں اور ان کی مردہ آوازیں

نہیں رہی ہوں۔ سرکس بیدار تھیں اور تیز قدم راہ گیروں کے بوجھ سے کراہ رہی تھیں۔ اس کے اپنے دروازوں پر کوئل گھونڈوں اور سواروں کا ہجوم تھا۔ سارے محل میں انسان سہمی ہوئی خاموشی سے کپکپے ہوئے سایوں کی طرح چل پھر رہے تھے، بیٹھے ہوئے تھے اور کھڑے ہوئے اونگھ رہے تھے۔ والد بزرگوار ایوب دمشق کے وزیر اعظم معین الدین کی قیام گاہ پر مشورے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ وہ اپنے بھائی طغرل کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا جس نے اس کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا بلکہ اسی طرح اپنے خیالوں میں کھویا ہوا بیٹھا رہا۔ وہ اس خاموشی سے جھنجھلا کر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ والد بزرگوار کی آواز گونجنے لگی۔ وہ لپک کر ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا جو اپنے دالان میں کھڑے شمعوں کی روشنی میں جگمگا رہے تھے۔ غلام ان کا زور بکتر اتار رہے تھے۔ چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی اور آواز پر غم کی پرچھائیں تیر رہی تھیں۔ اس کا چھوٹا بھائی توران شاہ ان کی گود میں پہنچ چکا تھا اور دوسرے بھائی بھی سہ آئے تھے۔ اب اس کی بہت بندھی۔ اس نے فکر مند لہجے میں پوچھا۔

”کیا افرنجی لشکر بہت طاقتور ہے؟“

”ہوں..... انواد ہے کہ دو لاکھ سوار ہیں ان کے پاس..... صرف ہاتھوں کی تعداد چار ہزار ہے..... لیکن جب تک تصدیق نہ ہو جائے کچھ یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔“

اس کے بعد طغرل اور عادل دیر تک باتیں کرتے رہے لیکن انہوں نے نہ زبان کھولی اور نہ کوئی توجہ دی اور جب یہ لوگ اٹھے تو وہ لینے کے لئے تشریف لے گئے۔ وہ اٹھ کر تیسری منزل پر چلا گیا۔ انتہائی تھکن کے باوجود اسے نیند نہ آئی۔ وہ چکنی ٹھنڈی چٹائی پر لیٹا کر ٹیس بدلتا رہا، خدا سے دعا کرتا رہا۔ بڑی مشکل سے صبح ہوئی۔ اس نے ہتھیار لگا کر اپنے منگی گھوڑے کا منہ چوما اور سوار ہو کر قحطان کے گھر پہنچا۔ دمشق کے گرجا کے سب سے بڑے پادری کا بیٹا اپنے دوست اور ولی عہد کو دیکھ کر کچھ گویا اور ہاتھوں ہاتھ لے کر اپنے کمرے میں پہنچا اور بڑے خلوص سے رسی باتیں کرنے لگا۔

”قحطان میرا خیال ہے قحطان کہ دمشق کی حفاظت کے فرض میں ہم دونوں برابر کے شریک ہیں۔ اگر افرنجیوں کے بجائے عباسی یا فاطمی چڑھ آتے تو بھی دمشق کو بچانا ہماری زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہوتا۔“

”میں..... اتفاق کرتا ہوں لیکن اتنے بڑے لشکر کے سامنے دمشق کتنے دن ٹھہر سکتا ہے۔ صرف شہنشاہ فرانس کی فوج ایک لاکھ ہے۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”افواہ ہے۔“

”لیکن ہم معلوم بھی تو کر سکتے ہیں۔“

”ہم؟“

”ہاں..... ہم..... میں اکیلا نہیں۔“

”کیسے؟“

”تم پادری کے بیٹے ہو۔ مجھے نوجوان پادری کے بھیس میں لے چلو۔ افرنجیوں

کی لشکرگاہ میں پہنچا دو۔ باتی سب کچھ میں کر لوں گا۔“

”تم کیا سوچنے لگے؟“

”اوں..... میں یہ سوچنے لگا کہ اگر بد نصیبی نے تمہیں پہچان لیا اور تم جاسوسی کے

جرم میں پکڑے گئے تو گورنر دمشق کے ولی عہد کی موت کے انتقام میں مجھ پر اور میرے ہم

نذہبوں پر کیا کچھ کر سکتی ہے۔“

”دیکھو اگر دشمن کی قوت کا اندازہ نہ ہو سکا تو ہماری خائف اور محصور فوجیں دمشق

ہار جائیں گی اور تم سزا سے محفوظ ہو گے اور اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو دمشق

جیت جائے گا اور تم جزائے قہدار ہو گے یعنی تمہاری گردن دونوں طرح محفوظ ہے۔ میرا

سوال البتہ ہے، تو میں مرنے پر تیار ہوں۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔“



جبل لبنان کی وادی میں جہاں سے دریائے زرافشاں (رود بردہ) سات شاخوں

میں تقسیم ہو کر دمشق کے مضافات کو زرخیز کرتا ہوا بہتا ہے، عیسائی لشکر میلوں میں پھیلا ہوا پڑا

تھا۔ زرافشاں کی سات شاخیں سات خندقوں کی طرح لشکرگاہ کے گرد حصار کئے بہہ رہی

تھیں۔ شام کے سائے میں دیودار کے اوسنے اوچے درختوں کے شامیانے کے نیچے دونوں

اپنے گھوڑوں سے اتر پڑے۔ گھڑیاں کھول کر سیاہ صوف کی لمبی لمبی عبائیں پہنیں، بکڑی کی

سیاہ صلیبیں گلے میں ڈالیں، ایٹش کی لمبی لمبی چھڑیاں ہاتھوں میں سنبھالیں اور ملازموں کو

ہدایتیں دے کر جنگی کانٹے دار جھاڑیوں میں گزرتی ہوئی دھندلی دھندلی پگڈنڈیوں پر چل

پڑے۔ یہاں کا ایک ایک ذرہ اس کا آشنا تھا۔ اونچے نیچے غیر معروف اور تاریک راستوں

پر جنگی جانوروں کی طرح اچھلتے پھاندتے وہ اس جگہ تک پہنچ گئے جہاں سبزے کے

میدانوں، خربوزے کے کھیتوں کے علاوہ سب، شفتالو، نارنج، شہتوت اور ترنج کے لاتعداد

باغات تھے اور جہاں عیسائی لشکر کے گھوڑے ہنہارے تھے، سپاہی جو ٹیلے گیت گارہے

تھے، جنگی بابے بجا رہے تھے، آسمان میں دھوکے کی ان گنت لکیریں منڈلا رہی تھیں اور

خیموں کے جنگل میں آوازوں کے وحشی پرندے اڑ رہے تھے۔ وہ قحطان کے آگے آگے چل

رہا تھا۔ سامنے دیودار کے درختوں کی دیوار کے نیچے جنگی گلابوں کی خاردار حد بندی تھی۔

اسی کے نیچے زرافشاں کی دوسری شاخ کا اتار تھا۔ وہ اپنے مولے سوتی جاے سے کانٹے

چھڑاتا کھار پر آگیا۔ قحطان نے اس کا بازو پکڑ لیا اور اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

سامنے پانی میں منڈالے ایک سنہرے رنگ کا اونچا گھوڑا کھڑا تھا جس کی ٹخلیں

کاشی میں چاندی کے رکاب جھولی رہے تھے اور سر پر شعلہ رنگ کنگری تپ رہی تھی۔ اس کے

بیچھے پانی کے کنارے کنارے اتار میں بہت سے اونچے، بھاری اور سجے جانے گھوڑے

جر رہے تھے یا پانی پی رہے تھے یا کھڑے تھے۔ لمبی چوڑی گوری چنی عورتیں کر تک چست

گودار قبائیں پہنے تھیں جس کے نچلے ڈھیلے حصے پر چوڑی چوڑی پلیٹیں تھیں اور جو پاؤں کے

نبیوں تک جھولی ہوئی تھیں۔ وہ ان زمین بوس دامنوں کو چٹکیوں سے پکڑے ہوئے ادھر

ادھر چل پھر رہی تھیں اور کچھ پتھروں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس کے بائیں طرف دور حدنگاہ

تک فرانسیسی فوجوں کے دستے زرہ بکتر پہنے، خود لگائے، سیدھی چوڑی بھاری ٹنگی تلواریں

لئے گھوڑوں کی باگیں تھامے کھڑے تھے۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ قحطان

سینے پر صلیب بنا کر دست بستہ کھڑا ہے اور ایک جیسے فٹ کی ٹارکن عورت مردانہ زیور پہنے

ہلکی سیدھی تلوار کی نوک اس کے سینے پر رکھے گھور رہی ہے۔ اس نے بھی جلدی سے صلیب

بنائی اور قحطان کے پیچھے پیچھے اس عورت کی تلوار کی زد میں چلنے لگا۔ گلاب کی جھاڑیوں کے

”مسلمانوں کے شہر سے جو بھی نکلتا ہے وہ لا کا ہو یا بوڑھا یا دیو کا بھیس بنا کر نکلتا ہے اس لئے آپ سے یہ سوال کیا گیا۔“

ایک مسلح نارس عورت نے تقریر پوری کر دی۔ اس نے مسکرا کر دیکھا اور پہلو میں رکھا ہوا سونے کا چھوٹا سا ”عصا“ اٹھا لیا اور کھڑی ہو گئی۔ قحطان آنکھیں پھاڑے کھڑا تھا۔ پھر وہ دونوں ایک قسم کی بے نام حرارت میں لے لئے گئے اور مسلح عورتوں کے گھیرے میں اس آراستہ گھوڑے کے پیچھے چلتے گئے جس پر عورت کے بھیس میں ایک فرشتہ بیٹھا ہوا تھا۔ زرافشاں کی تیسری شاخ اتر کر وہ سیب، شفتالو اور نارنج کے اجڑے ہوئے مالوے ہوئے باغات سے گزرنے لگے، پھر اس میدان میں داخل ہوئے جہاں ملک شاہ سلجوقی چوگان کھیلا کرتا تھا۔ اس کے تین طرف باغات کے کنارے کنارے فرانسیسی انواع کے اعلیٰ افسروں کے خیمے کھڑے تھے۔ مغربی سمت میں پھولوں کی اونچی جھاڑیوں سے گھری ہوئی ملک شاہ کی بنوائی ہوئی سرخ پتھر کی بارہ دری قناتوں کی حد بندی میں لے لی گئی تھی۔ اس کی پشت پر خر بوزے کے کھیتوں میں تاج فرانس کے محافظ دستے کے خیمے نصب تھے۔ ان خیموں سے قنات بندی کی حد تک سپاہی لنگی تلواریں لئے پہرے پر کھڑے تھے۔ اس کے پہلو میں اتنا چوڑا راستہ تھا کہ چار گھوڑے ایک ساتھ نکل سکیں جو سواروں کے دستے سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں سے فرانس کی ذات خاص کے رنگ برنگ کے خیمے اپنے سرور پر شاہی نشان سجائے دور تک کھڑے نظر آتے تھے۔ یہیں وہ دونوں روک لئے گئے اور پھر مشغلوں کی روشنی کے طلقے میں ایک بھورے اونٹنی خیمے میں ڈال دیئے گئے جہاں پورے تین دن اور تین راتیں عجیب و غریب لائق سوالوں کے یکساں جواب دینے میں گزر گئیں۔

پھر ایک بار وہ تہاباہر نکلا گیا اور اس عالی شان مدور بارگاہ کے سامنے لایا گیا جہاں ان گنت مشغلوں کی خوفناک زبانوں، لائق سوال و جواب کا بھیاںک آنکھوں اور تلواروں کا پہرہ کھڑا تھا۔ اس کے قریب ملک کا جھنڈا نصب تھا جس کے زرد پھریرے پر چاندی کا شیر ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں صلیب لئے اور تاج پہنے دہاڑا ہاتھ تھوڑی دیر بعد وہی نارس عورت اس کے قریب آئی اور اسے اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کر کے بارگاہ کے اندر داخل ہو گئی۔ ساری بارگاہ زردندے کی تھی اور سارے شہر زرد ریشم کے خلاف پہنے ہوئے تھے۔ فرش

سج میں ایک بھوری بکونی چٹان پر قلم کار ٹھہل بچھا ہوا تھا۔ اس پر ایک حور بیٹھی تھی۔ اس کی زرد ”نبا“ کے نیچے بھٹے کا وسیع گھیر زمین پر لوٹ رہا تھا۔ کمر پر سونے کے تاروں کی بٹی ہوئی ڈوری کسی ہوئی تھی جس کے دونوں سرے نیچے لٹک رہے تھے۔ اس ڈوری نے بالائی جسم کے تمام بیچ دھم بھار دیئے تھے۔ آسمانی ریشم کی ایک پٹی اس کے چہرے کو اپنے حلقے میں لے ہوئے تھی۔ اس پر نوک دار تاج نماز رکاز نوٹی تھی جس کے دو نیلے بھٹے دونوں کانوں کے نیچے شانوں تک پڑے تھے جن میں موتیوں کے چھچھے چمک رہے تھے۔ مصور کے نقش کے مانند کھینچے ابروؤں کے نیچے بڑی بڑی نیلی آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں جھکالیں جو یا قوت کی صلیب کو دیکھتی ہوئی اس کے پیروں پر ٹھٹھکیں جو مرغ زریں کے جوڑے کی طرح خاموش تھے۔ پھر اس نے فرانسیسی لہجے میں اجنبی مگر میٹھی لنگو فری کا سنی۔

”تمہارا نام؟“

”جون۔“ اس نے بغیر نگاہ اٹھائے جواب دیا۔

”دھن؟“

”میرے دادا پہلی صلیبی لڑائی میں برگنڈی سے آئے تھے۔ یہ وہ ملک کی فتح کے بعد انھوں نے ایک شاہی امیر کی بیٹی سے شادی کر لی اور دمشق میں سکونت اختیار کر لی۔ میرے باپ نے بھی دمشق کو اپنا وطن بنائے رکھا۔“

”دیمسک۔ دیمسک۔“

اس نے اپنے ارد گرد کھڑی ہوئی عورتوں کو مستر سے دیکھا اور سرور آواز کی کھٹک نے اس کے دل میں چٹکی لی۔ ڈوبے سورج کی الوداعی کرنوں نے اس حسین چہرے کے حسن و جمال کو اور روشن کر دیا تھا۔

”کیا کرتے ہو؟“

”میں نے خدا کے اکلوتے بیٹے مسیح کے بچے دین کی خدمت کے لئے حلف اٹھایا ہے۔ مسلمانوں کے گڑھ میں رہنے کی مصیبت اسی دن کے لئے قبول کی تھی کہ نب آپ کے مظہر و منصور لشکر اس کے دروازے پر آئیں گے تو میں آپ کو خفیہ اطلاعات بہم پہنچاؤں گا۔ آج صبح نے میری آرزو پوری کر دی۔“

پر زردقالین اور جنگی جانوروں کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں جو قد آدم شمعوں کی روشنی میں جگمگا رہی تھیں۔ بھاری بھاری زرد پردے سٹے کھڑے تھے۔ آبنوس کی لمبی میز کے سامنے ایک ہشت پہل کرسی پڑی تھی جس کے سیپ کے کام سے گندھے ہوئے پائے ہرن کی سیٹلوں کی طرح باہر کی طرف نکلے ہوئے تھے۔ میز کی دوسری طرف اسی وضع کی گر چھوٹی اور سادی کئی کرسیاں پڑی تھیں، وہ ان ہی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک طرف سے وہ برآمد ہوئی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ کرسی کے دونوں طرف خوشبودار شمعوں سے روشن جھاڑوں کی ٹھنڈی سفید روشنی میں اس کے کھلے ہوئے شانوں پر ڈھیر سرخ بال اور سرخ ہو گئے تھے۔ اس نے میز پر ہاتھ رکھا۔ مائی کی تصویروں کی طرح نازک سفید ترشی ہوئی انگلیوں سے جگمگاتی انگلیوں نے روشنی کر دی۔ نارن عورت نے میز کے برابر کھی ہوئی منقش تپائی پر ایک طشت رکھ دیا جس کی سیسے انگلیوں میں غبر سلگ رہا تھا۔ دوسری مسلح عورت نے اس کے لبادے کے نیچے زرہ پر لگے ہوئے خنجر کو نکال کر میز پر رکھ دیا۔ ملکہ جو اسے مسلسل گھورے جا رہی تھی اسی طرح بے نیاز بیٹھی رہی۔ پھر اپنی مخصوص زبان میں بولی۔

”تم فریج جانتے ہو؟“

”نہیں، میری ماں شامی ہے۔“

”فرانس کی بارگاہ میں ہتھیار باندھ کر آنے والے جنیوں کی سزا جانتے ہو؟“

”موت..... لیکن میں نہ تو جنسی ہوں اور نہ آیا ہوں۔“

”وہ کیسے؟“

”میرے دادا فرانسسی تخت و تاج کے جو شیلے خادم تھے اور وہی خون میری رگوں میں اچھلتا ہے اور میں یہاں تلواروں کی نوک پر لایا گیا ہوں اور پادریوں پر حملے عیسائی نہیں کرتے جن سے بچنے کے لئے زرہ اور خنجر کی ضرورت محسوس ہو۔“

ملکہ نے مسکرا کر دیکھا تو وہ مطمئن ہو گیا۔

”کتنی فوج ہے دمسک کے پاس۔“

”ایک لاکھ سوا ہتھیار پہنے کھڑے ہیں اور سلطان کے قاصد صوبوں کے گورنروں

کے پاس حکم لے کر جا چکے ہیں۔“

”کتنی کمک اور آسکتی ہے؟“

”تقریباً ایک لاکھ۔“

ملکہ کی نظریں کچھ سوچنے لگیں۔

”اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم سچ بھی بولتے ہو؟“

”دمشق کی آبادی چار لاکھ ہے اور بارہ برس کے لڑکوں سے لے کر ساٹھ برس کے

بزرگوں تک نے تلواریں پکڑ لی ہیں۔ شاہی لشکر اس کے علاوہ ہے۔“

”شہر کے عیسائیوں کی تعداد کیا ہوگی؟“

”دس ہزار سے بھی کم۔“

ملکہ دیر تک میز پر انگلیوں سے لکیریں کھینچتی رہی۔ پھر یک بیک نگاہ اٹھا کر اس کو

دیکھا اور مضبوطی سے لہجے میں بولی۔

”ہمارا خیال ہے کہ کسی کی اس رہبانیت کے مقابلے میں بادشاہوں کی خدمت

میں رہ کر اور بڑے بڑے کام انجام دے کر سچ کی زیادہ خوشنودی حاصل کی جاسکتی ہے۔“

”میں..... میں ملکہ عالم کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”ہم تم کو اپنے ذاتی محافظ رستے میں شامل کر سکتے ہیں۔“

اس کے منہ سے بے اختیار ہی میں نکل گیا۔

”میں اپنی زندگی کی اس زریں سعادت پر عمر بھر فخر کرتا رہوں گا۔“

وہ اپنے خیمے میں آ کر ساری رات پر ہول آوازوں اور نعروں میں گھرا ہوا تقدیر

کی اس گردش کے انجام پر سوچتا رہا۔ صبح ہوتے ہی اسے ملکہ کے خاصان بارگاہ کا لباس عطا

کیا گیا۔ اس نے گھنٹوں تک زرد چٹائی کی تنگ قبا، صلیب اور سیاہ چمک دار چڑے کے موزے،

سنہری کمیز اور سور کی چمکدار سیاہ ٹوپی پہنی۔ بالشت بھر چوڑی پٹی پر چاندی کا وہ سینہ بند لگا

جس پر ملکہ فرانس کا ذاتی نشان بنا ہوا تھا۔ کمر سے وہ سیدھی لمبی تلوار باندھی جس کا قبضہ

صلیب کی شکل کا تھا۔ بائیں شانے پر کوئی ڈھال اور دائیں ہاتھ پر نیزہ اٹھالیا اور کئی دن

تک بارگاہ خاص کے دروازے پر کھڑا پہرہ اور سلطان کو دلا سہ دیتا رہا جو اس بے نام حراست

سے عاجز آ گیا تھا۔ پھر بہار کی وہ صبح آگئی جب ”شام“ کی ہوا برف میں نہا کر اور گلابوں کی

خوشبو پہن کر نکلتی ہے اور دلوں کو شکار کرتی ہوئی چلتی ہے۔ وہ ناشتہ کر رہا تھا کہ قرنا بننے لگا۔ اس نے دوسرے خاص برداروں کی طرح جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور بارگاہ خاص کے شرعی دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا جس کے سامنے فرانس کی سلطنت کے بہترین منتخب گھوڑے آنکھوں سے چنگاریاں برسا رہے تھے۔ کسی کے کہنے پر وہ بھی ایک گھوڑا پسند کرنے چلا۔ پہلی ہی نظر میں ایک ابلق (گھوڑا) نتھنے پھلائے، دم کو چنور کئے ساز و راق سے آراستہ اگلے پیروں سے زمین کھرچ رہا تھا۔ اس نے لپک کر اسی کی لگام اچک لی، اچھل کر سوار ہوا اور ستون کی طرح قائم ہو گیا۔ یہ وہ گھوڑا تھا جسے بڑے بڑے مغربی شہسوار چھوٹے ڈرتے تھے۔ پھر اپنی بارگاہ کے خیموں کی پشت سے ملکہ برآمد ہوئی۔ دوسرے پاؤں تک سنہرے کام کا زہر بکتر پہنے، خود پر یا قوت کی کلفتی اور گلے میں یا قوت کی صلیب پہنے، ”نقرہ“ گھوڑے پر سوار خربلی چال چلتی آئی اور اس کی ران کے نیچے تڑپتے گھوڑے کو دیکھ کر محظوظ ہوئی اور ناراض عورتوں اور فرانسسی شہسواروں کو عقب میں لے کر جبل لبنان کی شکار گاہوں کی طرف چلی۔ تیرہ دہائی جنگل کے قلب میں احساس ہوا کہ ایک ایک ساتھی چھوٹ گیا۔ اس نے گھوڑا اتر چھا کر کے پیچھے دیکھا کہ ملکہ تو آ رہی ہے لیکن پٹری بگڑ گئی ہے اور رکابوں کے زاویے خراب ہو گئے ہیں۔ جبل کے اس گھنے جنگل میں جہاں تک پہنچتے پہنچتے سورج کی کرنیں کالی ہو جاتی تھیں اس نے ملکہ کے جانور کو تھام لیا جو لگام کو ماننے سے انکار کر چکا تھا اور اسے اپنا سہارا دے کر اتار لیا اور ایک چٹان پر زین پوش بچھا کر ملکہ کو بٹھادیا اور خود جانوروں کو باندھنے چلا۔ وہ دونوں کہنیوں کے سہارے نیم دراز ہو کر ہانپ رہی تھی۔ اور وہ اس کے متمنائے ہوئے چہرے پر لرزاتے موتی گن رہا تھا۔

”اگر آپ حکم دیں تو میں گھوڑا اٹھا کر سواروں کو تلاش کر لاؤں۔“

”نہیں... ہم پیاسے ہیں۔“

”میں اس جنگل کے چنے چنے سے واقف ہوں۔ یہاں سے تھوڑی دور پر وہ چشمہ

ہے جسے عرب ”جام بہشت“ کہتے ہیں۔ اگر آپ سوار ہوں تو۔“

ملکہ نے گردن موڑ کر ان گھوڑوں کو دیکھا جو آگے پیچھے ال ال کر ہانپ رہے تھے۔

اس نے ملکہ کے گھوڑے کو چٹان کے پاس لگا دیا اور اپنا سہارا پیش کیا جو قبول کر لیا گیا۔ زین

پوش اپنے گھوڑے کی گردن پر ڈال کر ملکہ کے گھوڑے کی راس پکڑ کر آہستہ آہستہ چلا۔ بھورے سرخ پتھروں کی لگاڑوں کے بیضی اور قدرتی حوض میں گچھلی ہوئی ٹھنڈی چاندی ”کل کل“ کی آواز کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ ایک اونچے پتھر کے کنارے ملکہ کو اتار کر اس نے گھوڑے باندھے اور سوچنے لگا کہ پانی کس طرح پلایا جائے۔ ملکہ اس کے ساتھ ساتھ چیشے کے اندر رگڑی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں پانی بھر کر خود پی لیا۔ ملکہ اس کو کھڑی دیکھتی رہی۔ اس نے تیسری بار اپنے ہاتھوں میں پانی بھرا۔ اتھ اس کے سینے تک پہنچے تھے کہ ملکہ نے آگے جھک کر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ ملکہ کے ہونٹوں کے لمس نے اس کے خون میں جلیاں بھر دیں۔ وہ ہاتھوں میں پانی بھرتا رہا اور ملکہ بیتی رہی لیکن اس طرح کہ اس کے یا قوت کے مہین خاموش ہونٹ اس کے ہاتھوں میں ہوتے اور غلیم کی بولتی آنکھیں اس کی آنکھوں میں۔ ملکہ کے متعلق پہلی بار اس کے دل میں ایک آرزو پیدا ہوئی کہ وہ اس چشمے کے کنارے کھڑا رہے اور قیامت تک ملکہ اسی طرح پانی بیتی رہے۔ وہ صدیوں تک اسی طرح کھڑے رہتے کہ گھوڑے نہنا کر اچھلنے لگے۔ ہرنوں کی چیخوں، پرندوں کی چہچہاہٹ اور سنناہٹ سے سارا جنگل گونج اٹھا۔ جنگل کا بادشاہ اپنے حرم سے نکلا تھا اور دہشت کا ایک ایک ذرہ اس کی پیشوا کی آواز سے دھڑک اٹھا تھا۔ ہراساں آفتاب اس کے سینے پر ڈھلک آیا۔ ملکہ کے خود کی کلفتی اس کی ٹھنڈی سے لگ گئی۔ پھر اس کی ڈھونڈتی ہوئی نظروں سے دیکھا کہ تھوڑی دور پر شاہانہ چال چلتا ہوا ان کی موجودگی سے بے نیاز شیر بائیں ہاتھ کی اونچی جھاڑیوں میں غروب ہوا چاہتا ہے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو دمشق کے والی کا چہرہ ادنیٰ عہد اس فرصت کو غنیمت سمجھتا لیکن ان چند لمحوں میں وہ جوان ہو چکا تھا، مرد بن چکا تھا اور اپنے سینے سے لگی ہوئی عظیم الشان خاتون کی نگاہوں میں اعتبار حاصل کرنے کے لئے بڑے بڑے لشکروں سے ٹکرا سکتا تھا۔ اس نے ملکہ سے الگ ہو کر پھرتی اور قوت سے شیر پر نیزہ مارا اور اسی لمحے تلوار گھسیٹ کر چھینا۔ پہلو میں دھنسا ہوا نیزہ لئے اور دھاڑتا ہوا شیر اس پر چڑھ آیا۔ ہر چند اس کے ہاتھوں میں اجنبی تھی لیکن تلوار تھی۔ تھوڑی دیر میں شیر کا فیصلہ ہو گیا، لیکن اس طرح کہ بائیں آستین اس کے خون سے لالہ کار ہو گئی۔ اس نے منجھے ہوئے شکاریوں کی طرح پورے حواس کے ساتھ اپنی خون آلود تلوار مردہ شیر کی

سے پھاند پڑے۔ سالار نے گھنٹوں پر کھڑے ہو کر تلوار نیام سے نکال کر چومی اور پھر نیام میں ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ ملکہ نے انتہائی ناگواری کا اظہار کیا۔

”اگر اس تلوار زادے نے اپنے آپ کو شیر کے منہ میں نہ ڈال دیا ہوتا تو ہم مدت کے ختم ہو چکے ہوتے۔“

پھر ایک جھٹکے کے ساتھ سپاہی سے لگام لے لی اور طاؤس کی طرح اڑ کر گھوڑے پر جم گئی اور ”جام بہشت“ کے کنارے سے شیر اٹھوا کر قیام گاہ کی طرف گھوڑا ڈال دیا۔



گردن کے بالوں سے رگڑ کر صاف کی۔ اسی لمحے اس نے دیکھا کہ ملکہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے انگلیوں کے بیچ سے اسے دیکھ رہی ہے۔ پھر وہ تقریباً دوڑتی ہوئی آئی اور اس کا خون دیکھ کر چیخ اٹھی اور اس کے داہنے شانے پر جھول گئی۔ وہ سامنے کی چٹان پر بیٹھ گیا۔ ملکہ اسے اپنے بے پناہ جسم کا سہارا دیے ہوئے تھی۔ ملکہ کا گھوڑا اسیں تڑا کر بھاگ چکا تھا۔ اس کا اہلقت کھڑا تھا اور مردہ شیر کو دیکھ کر ہنہار ہاتھ اپنے میں ڈبا ہوا اگلے پیروں کو پٹخ رہا تھا اور اس کے سامنے زرد ریشم کا زین پوش پڑا تھا۔ وہ اٹھا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا گھوڑے کے پاس گیا۔ اس کی گردن تھکی اور منہ چوما۔ پہلو میں کھڑی ہوئی ملکہ کو آنکھوں سے دیکھ کر پھر منہ چوما اور جھک کر زین پوش اٹھا لیا۔ اپنی تبا کے نیچے لوہے کے کپڑوں کے سینے بند کی جیب سے چھتا نکالا اور پھر بریٹھ کر زین پوش کو چاک کر کے جلانے لگا۔ اب وہ تخت و تاج کی بلندی سے نیچے اتر آئی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے تبا اتاری۔ بازو پر خون سے چمکی ہوئی زیر جاکے کی آستین اپنے منہ سے چاک کی۔ زین پوش کے ایک ٹکڑے سے زخم صاف کیا اور اس میں ریشم کی راکھ بھر دی اور دوسرے ٹکڑے کی پٹی باندھ دی۔ اس نے اپنے چہرے سے کسی تکلیف کا اظہار نہیں ہونے دیا سوائے اس کے کہ سیدھا سیدھا لیت گیا۔ تھوڑی دیر کے تکلف کے بعد ملکہ نے اس کا سراپے بکتر پوش زانوں پر رکھ لیا۔ ٹوپی ایک طرف گر گئی ملکہ اس کے سیاہ ریشم بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرنے لگی اور وہ اس لذت کو دوام عطا کرنے کے لئے عمر بھر شیروں سے زخمی ہونے کی دعائیں مانگنے لگی۔ ان دونوں کی زبانوں پر حفظ مراتب کے نقل لٹکتے رہے لیکن آنکھیں باتیں کرتی رہیں اور انگلیاں ہاں میں ہاں ملاتی رہیں۔ جب بھوک ناقابل برداشت ہو گئی تب وہ دونوں ایک دوسرے کا سہارا بن کر اٹھیں اور ایک دوسرے سے گھوڑے پر سوار ہونے کا اصرار کرنے لگی۔ آخر کار ملکہ نے اس کے آگے بیٹھ کر اسیں سنبھال لیں۔ وہ ملکہ کے زور پوش شانے پر منہ رکھے رخساروں کو سونگتا ہوا کمر میں بازو ڈالے بہشت کی سیر کرتا رہا۔ پھر اس نے جنگلی نارنگیوں، کھستے سیبوں اور کچے شفتالوؤں کے درختوں کو سونگھ جانے کی بددعائیں دیں اور آدم کی طرح جنت سے گھوڑے سے زمین پر اتر آیا۔ وہ ایک دوسرے کو پھیل کھلا رہے تھے کہ گھوڑوں کی ٹاپوں اور تھیاروں کی آوازوں سے سارا جنگل چھٹک اٹھا۔ ذات خاص کے رسالے کے سوار گھوڑوں

جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ مندے کے زرد اونچے مدور خیمے کے آہستہ پلنگ اور ٹھلیں بستر پر لیٹا اور مغرب کے ملائم کسبوں میں لیٹا پڑا تھا۔ بازو میں رکھے چاندی کے شمع دان میں بارہ خوشبودار شمعیں جل رہی تھیں۔ پلنگ کے سامنے نیچی لمبی خالی میز رکھی تھی۔ بائیں بازو میں آگ لگی ہوئی تھی اور دور دراز جیسی بھیانک آدازیں پہرہ دے رہی تھیں۔ پھر اسے اپنے سر ہانے کا ملائم گرم تکیہ جنبش کرتا محسوس ہوا۔ اس نے حیرت سے دیکھا کہ ملکہ گود میں سر لئے بیٹھی تھیں اور مسکرا رہی تھیں اور ان کی صلیب اس کی پیشانی پر لرز رہی تھی۔ ملکہ کے جسم کی ناقابل بیان خوشبو سے اس کا جسم معطر ہو گیا۔ اس نے ملکوتی طمانیت سے لمبی سانسیں لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اس کا سر تخت اور ٹھنڈے تکیے پر رکھ دیا گیا۔ پلنگ کی پشت پر جو الماری تھی اس کا سامان اٹھا اٹھا کر ملکہ میز پر رکھنے لگیں۔ وہ خون کی طرح سرخ ٹھنڈی کاشب خوابی لباس پہنے تھیں جس میں کمر کے نیچے چاروں طرف جھول پر پلٹیں بڑی تھیں اور جو اوپر پرست ہو گیا تھا۔ جب وہ ہاتھ اٹھا میں تو ڈھیلی آستینیں پھسل جاتیں اور کچی چاندی کی کلانیاں برہنہ ہو جاتیں۔ سرخ بال دونوں شانوں پر ڈھیر تھے۔ اس پس منظر میں ان کے تابناک چہرے پر نگاہ نہ ٹھہرتی تھی۔ پھر انھوں نے اپنے شانے کا سہارا دے کر اسے اٹھایا اور میز کی طرف رخ کر کے بٹھا دیا جس پر چاندی کی پلیٹوں میں خشک میوے، تازے پھل، مٹھا ہوا گوشت، تازہ شوربا اور میٹھے بسکٹ ڈھیر تھے۔ اس کی بیداری کے انتظار کا ذکر کئے بغیر وہ مہذب بھوک انسانوں کی طرح کھانے لگیں اور اسے خیال آیا کہ وہ الف لیلیٰ کے ابوالحسن کی طرح بیداری میں خواب دیکھ رہا ہے۔ اس یقین سے اسے حسرت ہوئی کہ ایک

جلیل المرتبت ملکہ اپنی نجی زندگی میں ایک عام شامی عورت کی طرح پُر محبت اور خدمت گزار ہوتی ہے۔ پہلی بار اسے یہ موقع نصیب ہوا تھا کہ ایک مطلق العنان ملکہ اور حسین ترین نا محرم عورت کی بے تکلف قربت سے آسودہ ہو سکے۔ اس کے بازو کا زخم جیسے مندل ہونے لگا۔ وہ اس کی پلیٹ میں سونے کے دستے کی چھری سے گوشت کا ٹکڑا کاٹ کر انھیں اور الماری سے برچھی کی وضع کی بوتل اور دو آگینے نکال کر میز پر رکھ دیئے۔ وہ ایک آگینہ اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اس کے گلے پر آب زری کی بیلوں کے درمیان خطِ نسخ میں امراء القیس کے رندانہ اشعار اس فنکاری سے لکھے ہوئے تھے گویا زرد بھول کھلے ہوں۔ ملکہ نے دونوں آگینے لبریز کر دیئے۔ اس نے خیز کی محفلوں کی داد دی تھی اور سرخوش ہوا تھا۔ لیکن اس گھٹنگھور سرمستی سے نا آشنا تھا جو درپیش تھی۔ وہ آگینوں سے آنکھ ملاتے بھی جھجک رہا تھا۔ ملکہ نے خود اعتمادی سے اشارہ کیا تو اس نے آگینہ اٹھا لیا اور دنیا کے سب سے حسین ساتی کی تقلید میں نصف سے کم نگل گیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے گھوڑے نے سر پر ناپ ماری ہو۔ دوسرے دور میں وہ کسی حد تک انگیز کر سکا۔ تیسرے آگینے کے بعد وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ دنیا کی سب سے ظالم فوجوں کے قلب میں بے دست و پا ہے اور اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے قصر کی سنسان پردہ پوش غلام گردش میں گھس آیا ہے اور مغرب کی وہ الیہی کنیز اپنے آقا کی خدمت سے مشرف ہے جسے اس کے والد نے ہزاروں دینار سرخ میں خرید کر اپنے بیٹے کو بخش دیا ہے۔ اس نے سرور آنکھیں اٹھا کر دیکھا بلکہ اپنے شفق کول لباس میں صبح کے سورج کی مانند آنکھیں خیرہ کئے دے رہی تھیں۔ دراز پلکیں نیم باز آنکھوں پر لڑکھڑاہی تھیں۔ گہری آنکھیں اور گہری ہو گئیں۔ شرق کے افسانوں کی عاشق ملکہ طلوع ہوتے ہوئے شرق کے سب سے بڑے سلطان کی بے پناہ دلکشی سے مسحور ہو چکی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا تو ملکہ ٹوٹ کر اس کے آغوش میں آ گئی۔



صبح کو کوئی شہنشاہِ فرانس کی آمد کا ہنگامہ گرم ہوا۔ وہ دریائے اردن کے شمال مشرق کی اسلامی آبادی کو تہ دلا کر رہا تھا۔ ملکہ کی دوسری زندگی کی اطلاع ملی اور وہ فوراً سوار ہو گیا۔ شاہی طبیب نے کئی کئی بار اس کے زخم کو دیکھا اور وہی دنوں میں اس قابل کر دیا

کر دہ آسانی سے چل پھر سکے۔ پھر اسے حکم ملا کہ وہ شام کو 'نائٹ' کا اعزاز قبول کرنے کے لئے دربار میں حاضر ہو۔ سرخ بارہ دہری کے نیچے شامیانہ لگا تھا جس کے شہتیر غلاف پوش اور غلاف چاندی کے تاروں کے پھول پہنے ہوئے تھے اور اس کے چاروں گوشوں میں فرانس اور انیسک اور شہنشاہ اور ملکہ کے جھنڈوں کے بھڑک دار پھریے لہرا رہے تھے۔ قالینوں اور کھالوں کے فرش پر جرمنی، آسٹریا، صقلیہ، برشلونہ اور فرانس کے نواب، نائٹ، سردار، امیر اور طبقہ الوادیہ اور طبقہ البیطار کے شہسوار اور جرمانیہ کے مشہور شمشیر زن بیٹھے ہوئے تھے۔ بارہ درہی کے چبوترے پر اطلس کے زرد نسکیرے کے نیچے چاندی کے تخت پر طلائی کرسی بچھی ہوئی تھی۔ اس پر میانہ قد، معمولی خدو خال اور بیقرار ہاتھ پیروں کا مالک، ایک کم رو آدمی جگمگا تالباں اور بیش قیمت تاج پہنے مرغ زریں بنا بیٹھا تھا۔ اس کے ایک طرف ڈیوک آف برگنڈی دونوں ہاتھوں پر تلواریں لئے کھڑا تھا تو دوسری طرف پیرس کے شاہی گرجا کا اسقف انجیل حائل کئے موجود تھا۔ پھر وہ لوئی کے خاص برادران کے گرزوں کے جلو میں نیزوں کی زبانوں اور بنے ہوئے دیوبیکر جسموں اور چمکدار تلواروں اور آئینہ ہند بیکتروں کے جھوم سے گزرتا ہوا تخت کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک خادم نے اسے گھٹنوں پر گر دیا اور کمر سے بیٹی کھول دی۔ برگنڈی کا ڈیوک جس کے قد کو خود کی کلنی نے اور بالا کر دیا تھا آگے بڑھا اور تلوار لوئی کے ہاتھ میں دے کر اپنی کمر سے نائٹ ہڈ کی زرنگار پٹی کھول کر اس کی کمر میں باندھ دی۔ اب لوئی نے پادری کے منہ سے نکلتے ہوئے مقدس کلمات کے ساتھ کھڑے ہو کر تلوار کو چپا کر کے اس کے سر اور دونوں شانوں پر چھلایا اور تلوار برگنڈی کے ڈیوک کو پکڑادی جس نے پورے احترام کے ساتھ اس کی بیٹی کے منقش نیام میں ڈال دی۔ پھر لوئی نے اپنا برہنہ ہاتھ پیش کیا جس پر اس نے عقیدت کا بوسہ دیا۔ اب جنگی باجے جنگی دھن میں بجنے لگے اور وہ گردن جھکا کر چاروں طرف حسین کے نعرے لگانے والوں کا شکریہ ادا کرتا رہا۔ جب وہ اگلے قدموں سے واپس ہوا اور لوئی اندر چلا گیا اور اس کی کرسی پر پردہ ڈال دیا گیا تو ایک ایک آدمی نے مبارکباد دی۔ وہ بڑی احتیاط سے ہاتھ ملاتے رہے لیکن زخم میں تکلیف شروع ہو گئی۔ اس نے چلتے چلتے قحطان کو چند ہدایتیں دیں اور اپنے بیمار خانے کی طرف چلا جو ملکہ کی بارگاہ کی قنات بندی کے اندر تھا۔ داغے کے دروازے پر ایک لائے

تھے۔ سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق ہو کر وہ اس گھوڑے پر سوار ہوا جو اس کی خطرناک محبت کا کیلا راز دار تھا۔ آج وہ پہلی بار شاہی قیام گاہ کی پشت پر میلوں میں پھیلے ہوئے خیموں کے شہر کی طرف چلا تھا۔ آسمان پر چاند کی گول مشعل جل رہی تھی اور دمشق کے گلابی جاڑوں کی ٹھنڈی ہوا خنجر کی طرح کھلے ہوئے حصوں کو کاٹ رہی تھی اور وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھتی ہوئی چھوٹے اریوں اور خرگاہوں کے درمیان سے گزر رہا تھا جس کے دروازوں پر پنشانے جل رہے تھے۔ اس کی تلوار کا سیمیں نیام گھوڑے کی آہنی پاکھر سے ٹکرا رہا تھا اور وہ آنکھیں پھاڑے تین طرف دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ راستوں میں جگہ جگہ بڑے بڑے الاء روشن تھے جن میں مسلمانوں کے گھروں سے لوٹے ہوئے لکڑی کے منقش صندوق، مقدس کتابوں کے نسخے، بچی کاری کئے ہوئے دروازے، آہنی کرسیاں، اخروٹ کی تپانیاں، اور صندل کی چوکیاں جتنی جتنی کر جل رہی تھیں۔ بھالوں میں بیوست ادھر سے ہوئے پرندے، بھیڑ اور بکری کے بچے ٹھن رہے تھے۔ نیزہ کے قرا بے کھجوروں کی چٹائیوں سے ڈھکے تھے، ٹوٹے گھروں کے ٹکڑے ادھر ادھر ڈھیر تھے۔ انگوڑی کچی شراب کے مشکیزے مردہ جانوروں کی طرح پڑے تھے۔ رخی سپاہی جنگلی آوازوں میں چیخ رہے تھے، چلا رہے تھے، گارہے تھے، بجا رہے تھے، ہتھیاروں کو چکارہے تھے، گھوڑوں کا سازی رہے تھے، شام اور عراق کی سرحدی بستیوں سے پکڑی ہوئی ننگی معصوم عورتوں کے جسموں کو بھنبھوڑ رہے تھے۔ اس کا خون کھول گیا اور ہاتھ تلوار کے قبضے پر چلا گیا اور جی چاہا کہ..... لیکن وقت کی نزاکت نے صبر کی تلقین کی۔ وہ جلتا پھٹکا اس حد بندی تک آ گیا جہاں جرمانیہ کے آہن پوش بیدل مجاہد پڑاؤ کئے ہوئے تھے۔ مرکاب سپاہی جو آگے آگے چل رہے تھے اپنے گھوڑے موڑنے لگے۔ اسی وقت پہلو کے خیمے سے بوڑھی بھیا یک مردانہ چیخ نے اسے جھنبھوڑ ڈالا اور وہ بلبلا اٹھا۔ دروازے پر لوہے کے ڈانڈوں والے نیزوں کی انیوں میں اڑی ہوئی مشعلیں جل رہی تھیں اور سبز اشتیوبی ریشمیں پردہ پڑا تھا جس پر چاندی کے تاروں سے قرآن پاک کی آیتیں کڑھی ہوئی تھیں اور جو شامی ابتدائی سردی کی برقی ہوا میں لرز رہا تھا وہ مع گھوڑے کے اندر گھس گیا۔ اندر سے کشادہ خیمے کے پتوں بیچ شہتر سے ایک بوڑھا آدمی بندھا ہوا تھا جس کی سفید بچی کھٹی داڑھی کانپ رہی تھی اور ننگے جسم کے تازہ زخموں سے خون بہہ رہا

ترنگے زرہ پوش آدمی نے بڑی عیار مسکراہٹ سے اس کو مبارکباد دی اور کیڑ توڑنگا ہوں سے گھور کر ہاتھ ملایا۔ جب وہ اپنے خیمے کے اندر جانے لگا تو وہی اونچی چوڑی چٹکی نارمن عورت آئی جو اسے تلوار کی نوک پر یہاں تک لائی تھی اور جس کا نام ایلس تھا، اس کو مبارکباد دی اور اس کے ساتھ ہی خیمے میں داخل ہوئی۔ لباس تبدیل کرنے میں مدد دی اور اس کے لیٹ جانے کے بعد بڑے ادب سے گزارش کی۔

”آپ آرک سے محفوظ رہنے کی کوشش کیجئے۔“

”آرک؟..... کون؟“

”آرک جرمانیہ کے سواروں کا سردار ہے۔ یورپ میں اس کی بہادری کی بڑی دھوم ہے۔ اسے ملکہ عالم کی خدمت میں بھی لیکن ادھر کئی دن سے باریاب نہیں کیا گیا۔ آج اس نے آپ کو دیکھا ہے، آپ کا اعزاز دیکھا ہے اور میں نے اس کی دعا باز آنکھوں میں سازش ریگتی محسوس کی ہے۔“

ایلس کے جانے کے بعد وہ بڑی دیر تک ایلس اور آرک کے متعلق سوچتا رہا۔ پھر زندگی اور زندگی کے خدشات پر غور کرتا رہا۔ ہتھیلی پر ٹپک پڑنے والے مواقع پر فکر کرتا رہا جو اگر مٹھی میں بند کر لئے جائیں تو زندگی کی نچ بدل جاتی ہے اور اگر ان کو ہتھیلی سے گر جانے دیا جائے تو زندگی عذاب ہو جاتی ہے اور انسان مٹی کے ڈھیلوں سے بھی سستے ہو جاتے ہیں۔ پھر اسے اپنے باپ کی یاد آئی جو دمشق کے چھوٹے سے مولے کو اس قہار لشکر سے نکرانے کا خواب دیکھ رہے تھے اور چہیتے بیٹے کی خطرناک خدمت سے منسوب اندیشوں سے خائف تھے۔ پھر اس نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ موجودہ کیفیت ایک زندہ حقیقت ہے اور گزشتہ دنوں میں جو کچھ پیش آیا ہے وہ لوہے محفوظ میں پہلے ہی مقدر ہو چکا تھا اور یہ زرکار حادثہ کسی شاندار کارنامے کا دیباچہ ہے۔

اس رات ملکہ فرانس کے منظور نظر ٹائٹ، خاص برداروں کے افسر جون دی نائٹ کو لشکر کا انتظامی گشت کرنا تھا۔ اسے فرانسیسی اسلحہ خانے کا سب سے قیمتی بکتر پیش کیا گیا جس کے سینے پر سونے کا عقاب اڑ رہا تھا اور خود پر سونے کی کلغی لگی تھی اور ڈھال پر فرانس کا تاج بنا تھا اور جزاؤں میں کھڑکھڑاتی ہوئی وزنی تلوار کے صلیبی قبضے پر جواہرات جڑے

تھا اور اس کے سامنے ایک آدمی چھوٹی سی مشعل لئے پھونک ڈالنے کے انداز میں کھڑا تھا۔ ابھی وہ اس منظر کے خوف پر غالب نہیں ہو پایا تھا کہ ایک لمبے ترنگے آدمی نے اس کے گھوڑے کی زنجیریں تھام لیں۔ اس کی ایک بغل میں ایک پھول سی لڑکی فتراک کے شکار کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔ اس کے گھوڑے کو ڈھکیل کر خیمے کے باہر کر دیا گیا۔ وہ بوڑھا آدمی اسی طرح چیخا رہا اور وہ دروازے پر کھڑا سنتا رہا۔ ایک سوار نے اس کے گھوڑے کی راسیں شاہی بارگاہ کی طرف پھیر دیں اور وہ چلنے لگا اور اسی رات کی اس مقدس گھڑی میں جب فرشتے آسمانوں سے نزول کرتے ہیں اور گنہگار انسانوں اور بدنصیب قوموں کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تقدیر نامے سروں پر رکھ کر لے جاتے ہیں اور عرشِ اعظم کا پایہ پکڑ کر خدائے تعالیٰ اور خدائے کریم کے حضور میں گڑگڑاتے ہیں اور تقدیریں بدل ڈالنے کا پروانہ حاصل کرتے ہیں۔ رات کی اسی برگزیدہ گھڑی میں اس نے گھوڑے کے ایال اور تلوار کا قبضہ پکڑ کر آنسوؤں سے وضو کی ہوئی آواز میں خدا سے دعا مانگی کہ اگر ہمارے امتحان اور عذاب کا زمانہ ختم ہو گیا ہو تو مجھے وہ حوصلہ اور طاقت عطا کر کہ میں ان ناپاک بھیڑیوں کو اپنی تبرک سرزمین سے ڈھکیل کر سمندر میں غرق کر دوں اور اگر یہ سعادت میرے مقدر میں نہیں ہے تو ابھی اور اسی وقت اور اسی گھڑی مجھے موت عطا کر دے۔ پھر ایک خیمے سے بڑی سریلی آواز آئی۔ اس نے راسیں کھینچ لیں اور سننے لگا۔

”میرے بال مشک کے دریا کی پر شور موجیں ہیں۔“

میری آنکھوں کے آئینوں میں وہ شراب جھلکتی ہے جس کے لئے فرشتے آسمانوں پر عبادت کرتے ہیں۔

اگر سورج اور چاند کو ایک ساتھ دیکھنا ہو تو میرا گریبان کھولو اور میری رفتار کا دوسرا نام ہی گردشِ ایام ہے۔“

وہ گھوڑا بڑا ہا کر خیمے کی جھری پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ولایت دمشق کے سب سے بڑے عاملِ فضیل کی مشہور کنیز مغیرہ جو آکا لباس پہنے مشعلوں کی روشنی میں تڑپ رہی تھی، اور گار رہی تھی اور بعلبک کا عامل عیاذِ صلیبی افسروں کے کانوں سے خوشامداندہ سرگوشیاں کر رہا تھا۔ وہ ساری رات بکتر کے تابوت میں دفن گھوڑے کی پیٹھ پر گڑا رہا۔



لوئی ہفتم شام کے شمالی مضافات کو تاراج کر کے واپس آ رہا تھا اور شہنشاہ کو نریڈ بعلبک کو غارت کر کے لشکر اٹھا چکا تھا۔ ملکہ ان دونوں لشکروں کے انتظار میں پڑی ہوئی تھی اور چاہتی تھی کہ ان کے ساتھ ہی دمشق پر یلغار کرے اور ایک ہی ریلے میں فیصلہ کر دے۔ صبح کی نماز کے بعد ہی ایبک نے اسے خبر دی کہ دن میں آرام کر لو کیونکہ آج رات دمشق کی فصیلوں پر شب خون کے پرچم اڑائے جائیں گے۔ پھر اس نے ملکہ سے تصدیق کی اور بدحواس ہو گیا۔ جب قطان سے ملاقات کی کوئی صورت نہ نکلی تب وہ ملکہ کو پرچا کر درافشاں کی سیر کو نکلا اور تھوڑی دیر بعد ملکہ اپنی خدمت گزار عورتوں کے ساتھ مچھلی کے شکار میں پھنس گئی۔ وہ گھوڑا اٹھا کر ”برج فتح“ کے سنان دروازے پر آیا۔ یہ برج عماد الدین زنگی نے اپنی فتح کی یادگار میں بنوایا تھا جو ایک طرف جبل لبنان کے جنگلی راستوں اور دوسری طرف زرافشاں کے اتاروں کی نگہبانی کرتا تھا لیکن اس کی فوجی اہمیت ختم ہو چکی تھی اور وہ شکاریوں کی قیام گاہ بن کر رہ گیا تھا۔ اس نے چاروں طرف گھوم پھر کر اطمینان کیا، پھر راسیں دروازے کے قلابے میں باندھیں اور تلوار کھینچ کر پوری احتیاط سے برج کی آخری منزل پر چڑھ گیا۔ اس نے شیرازی کبوتروں کا جوڑا طاقوں سے اتارا۔ ایک کبوتر کو پکڑ کر گالوں سے لگایا اور گردن پر بوسہ دیا اور زنج کر کے دوسرے کبوتر کو رنگ دیا اور ہوا میں اچھال دیا۔ وہ دمشق کی طرف اڑتے ہوئے کبوتر کو آنکھوں پر ہتھیلی کا چھجھکا بنائے دیر تک دیکھتا رہا۔ جب وہ کھو گیا تو پھر مردہ کبوتر کو پھینک کر بھاری بھاری قدموں سے نیچے اتر آیا۔ برج فتح کا ایک چکر لگا کر وہ کانٹے دار جھاڑیوں اور کھجور کے درختوں میں کھوئے ہوئے جیشے کے کنارے آیا اور وضو کرنے لگا۔ بڑی دیر تک پوری تحویت کے ساتھ اپنے خدا کو یاد کرتا رہا اور دمشق کی حفاظت کی دعا مانگتا رہا۔

شام ہوتے ہوتے شہنشاہ کو نریڈ آگیا اور آتے ہی طبل جنگ پر چوٹ لگادی۔ رات چڑھتے چڑھتے پچاس ہزار بکتر پوش سواروں کا جہاز لشکر دمشق پر شب خون کے لئے چڑھ دوڑا۔ آگے آگے لوئی ہفتم بیس ہزار سواروں کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس کے پیچھے جزیانیہ کے دس ہزار مشہور سورما پیدل تھے۔ ان کے عقب میں کو نریڈ شمالی یورپ کے بیس ہزار لشکر

کومان کی طرح پھیلے ہوئے آ رہا تھا۔ ابھی مشرق کی پیشانی پر سیاہی مسلط تھی کہ مسلح آدمیوں کا سمندر دمشق کی تفصیل کے نیچے چھائے ہوئے باغوں کے سامنے آ گیا۔ کوزیڈ کے نقشے کے مطابق لشکر کو باب مغرب پر ہلکے کر کے شہر میں گھس جانا چاہئے تھا لیکن اس کی گزارش پر ملکہ نے لوئی کی زبان سے مشورہ دیا کہ لشکر اس طرح پھیلا دیا جائے کہ شمالی مغرب اور جنوب کے دروازے ہدف بن جائیں اور زور کر کے تین طرف سے شہر میں داخل ہونے کی کوشش کی جائے کوزیڈ نے بحث میں وقت کھونے کے بجائے اتفاق کر لیا۔ سارا لشکر باغوں میں پھیل کر چلنے لگا۔ ابھی وہ پتھر کے ان مکعب مکانونوں سے دور تھے جو شہر پناہ کے ددموں کا کام انجام دیتے تھے کہ درختوں سے نفع کی ہانڈیاں برسنے لگیں جن کی چیتنی ہوئی ہولناک روشنی موت کے خنجر کی طرح لپکنے لگی اور کوزیڈ جیسا جانناز مجاہد گھوڑے سے اتر کر مسیح کی دہائی دینے لگا۔ میلوں میں پھیلے ہوئے لشکر کی ایک ایک رانچ زمین نالوں، فریادوں اور آنسوؤں سے چھلک اٹھی۔ جب ہانڈیوں کا زور کم ہوا تو تیروں، نیزوں اور پتھروں کی بارش شروع ہوئی تب افرنجیوں نے سنبھالا لیا اور گھوڑوں پر سوار ہو کر دھاوا کیا اور اپنی صفوں کو قائم کر کے چلے۔ اب درختوں پر چھپے ہوئے مسلمان سپاہی پھاندنے لگے اور جنگ مغلوبہ شروع ہو گئی۔ لوئی جس سے ایک عورت نہیں سنبھلتی تھی اس یلغار کو کیا سنبھالتا واپسی کا قرنا پھونک کر پیچھے ہٹ آیا۔ اب شہنشاہ کوزیڈ نے نیزوں پر مشعلیں چڑھائیں۔ باب شمال کی کمان اپنے بھتیجے کوسوینی اور فرانس کی بدترین فوجوں کی ہمت بندھانے چلا اور آتے ہی آتے فرانس کی چھوڑی ہوئی جگہ کو اپنے سواروں سے بھر دیا۔ جرمانیہ کے سوار گھوڑوں سے اتر پڑے اور اپنی شہرت کے مطابق زمین پر گھٹنے گاڑ کر مسلمانوں کے سیلاب کو نیزوں پر واقعی روک لیا۔ وہ ملکہ پر اپنی تکیوں کی ڈھال کا سایہ بنامیدان سے دور کھڑا رہا۔ اور خود کے چہرہ پوش میں بند ہونٹ مسلمانوں کی فتح کی دعا مانگتے رہے۔ صبح ہوتے ہوتے لشکر کا ایک حصہ کٹ چکا تھا اور کوزیڈ باغوں سے پیچھے ہٹ آیا تھا اور مسلمان اپنی کمین گاہ میں واپس چلے گئے اور دو پہر ہوتے ہوئے سینٹ پال کی مقدس صلیب ایک ڈھلوں گاڑی پر چڑھ کر آگئی جسے بارہ کنواریاں اور چوبیس اسقف سفید داڑھیوں پر سیاہ لباس پہنے انجیل مقدس کی دعائیں پڑھتے روتے ہوئے اور عقب میں کل بوج لئے آگئے۔ ملکہ نے اسے دیکھتے ہی

سینے پر صلیب بنائی اور زور و کمر مسیح کے غضب کو اکسانے لگی۔ لاشوں سے پھلے ہوئے باغوں کو دیکھ کر تازہ دم لشکر جوش و خروش سے نعرے لگانے لگا۔ بڑے بڑے نائٹ طبقہ داؤ دیہ اور ہلیطار کے شہسوار ہاسٹلرز کی آبرو اور ٹمپلز کے نام لیوا صلیب کے سامنے گر کر شہید ہو جانے کی قسمیں کھانے لگے۔ خود کوزیڈ ننگے سر آیا اور بڑی دیر تک کھڑا آنسو بہاتا رہا۔ پھر سیکڑوں دبا بے اور مخنقیں باغات پر پتھر برساتی رہیں۔ لمبی چوڑی ڈھالوں کے سائے میں افرنجی سورا خاص کوزیڈ کی کمان میں لیٹ کر آگے بڑھنے لگے اور ایسا معلوم ہوا کہ باغوں کے مورچے، مکعب، سنگین مکانونوں کے ددمے اور شہر پناہ کی کمین گاہیں سب مٹی کے کھلونوں کی طرح ٹوٹ پھوٹ کر بہہ جائیں گی۔ اس نے اپنے حواس کو درست کیا اور ملکہ کو سمجھا بھگا کر گھوڑے اڑاتا ہوا اسقف اعظم کے پاس پہنچا اور لوئی کی پشت پناہی میں ارشاد کیا کہ شہر پناہ کا مشرقی حصہ اتنا کمزور ہے کہ آپ پہنچتے پہنچتے شہر پناہ میں داخل ہو جائیں گے۔ اس بات میں وزن اس لئے محسوس ہوا کہ بہر حال وہ حصہ شہر کی پشت پر تھا اور وہاں حملہ آور غنیم اپنا وقت غارت کرنے کے بجائے پہلے ہی سامنے کے مغربی حصہ پر ٹوٹ پڑنا آسان سمجھتا تھا۔ ملکہ کی سوگوار صورت، دردناک آواز اور لوئی کا جھلسا ہوا زہر بکتر کام آیا اور صلیب مقدس مشرق کی طرف چلنے لگی۔ کوزیڈ جود بابوں اور مخنقیوں کے سائے میں باغ پر نازل ہو چکا تھا اور ایک حد تک عبور کر چکا تھا اس نئے حکم پر بوکھلا گیا لیکن اسقف اعظم کے حکم کی تعمیل پر مجبور ہو کر پیش قدمی کرتے ہوئے سارے لشکر کو لپیٹ کر شہر پناہ کی مشرقی دیوار کے نیچے ڈال دیا۔ اس کارروائی میں شام ہو چکی تھی۔ لوئی ہفتم نے کمر کھولنے کا قراتا بجا دیا۔ کوزیڈ بھی گھوڑے سے اتر آیا۔ بادشاہوں اور نوابوں کے لئے خیمے نصب ہو رہے تھے کہ ہنگامہ مچ گیا۔ اب صلیبی لشکر کے آگے شہر پناہ کی اونچی مضبوط دیواریں اور نیچے بنجر زمین تھی جو کچھ دور چل کر بولوں کے ناقابل عبور جنگل سے مل جاتی تھی۔ بائیں بازو پر کئی فصلوں کے کھیت تھے جن کے سلسلے دمشق کے مشہور عالم باغات تک چلے جاتے تھے اور داہنی طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا غیر آباد علاقہ تھا۔ ان میں اکا دکا پانی کے چشمے تھے جن کو زہر ڈال کر بیکار کر دیا گیا تھا۔ جب کوزیڈ کا ذاتی دست پانی ڈھونڈ کر ہار گیا تو زرافشاں کی طرف چلا لیکن اب زرافشاں کے مشرقی کنارے پر اس کے چچا اور شام کے مشہور سپہ سالار اسد الدین شیر کوہ تازہ دم بکتر پوش

مجاہدوں کا سمندر لئے کھڑے تھے جن کی موجوں نے زرافشاں کی روانی چھین لی تھی۔ حکم سے معذور اور پیاس سے مجبور سپاہیوں نے باگیں اٹھا دیں اور شیر کوہ نے انھیں کاٹ کر پھینک دیا۔ کوئی تلوار کا مارا خوش نصیب زندہ بچ گیا اور یہ خبر بد سنائی۔ اس نے گھوڑے کی پیٹھ ہی پر گردن جھکا کر خدا کا شکر ادا کیا۔ کوزیہ جس کے لنگر سے گھوڑا دھچکتا تھا جنگھار بنا ہوا نکلا اور المانیہ سے انتر تک اپنی تاریخ رکھنے والے نای گرامی خاندانوں کے شمشیر زنوں کو نام لے لے کر پکارا اور پانچ ہزار سواروں کے ساتھ جن میں صرف نائمنس بائیس سو تھے پانی لینے چلا اور جاتے ہی جاتے شیر کوہ پر ٹوٹ پڑا لیکن ہزاروں لاشیں اور ان کی دگنی مشکیں اور ان سب سے زیادہ قیمتی اپنی آبرو دکھو کر صرف جان بچا سکا۔ وہ ساری رات سو تے جاتے خدا کا شکر ادا کرتا رہا۔

ملکہ جو صلیب کے نام پر مشرقی شہروں اور قلعوں کا شکار کھیلے نکلی تھی دمشق کے نقصان زدہ محاصرے سے اکٹ لگی تھی اور لوئی کی الجبائی قربت سے اکٹانے لگی تھی دمشق کے مشرق میں دور دراز مقامات سے رسد لانے والے لشکر پر امیر ہو کر ستاروں کی چھاؤں میں سوار ہوئی۔ مسلح نارمن عورتوں کے ہجوم میں وہ اس کی باگ سے باگ اڑاتا چلا جا رہا تھا۔ جربہ کے چھوٹے سے دیران قصبے کو کوسے ہوئے جب وہ آگے بڑھے تو دمشق میں میل پیچھے چھوٹ چکا تھا۔ اس صحرائے شام کے سلسلے نظر آنے لگتے تھے جس کا سلسلہ عربستان تک چلا جاتا ہے اور جہاں کا موسم دن رات میں دو مرتبہ کچل بدل لیتا ہے اور مستقل طور پر دمشق سے مختلف رہتا ہے۔ یہاں اس نے ببول اور سنا کے جنگلوں کے میڑھے میڑھے راستوں میں الجھا کر ملکہ کو لشکر سے کاٹ لیا اور لشکر کی سمت مخالف میں اڑا لے گیا۔ پلٹ کر دیکھا تو گرمی سے پریشان ایلیس، اس کی کچھ رفیقوں اور ذات خاص کے محافظ رسالے کے چند سواروں کے سوا کوئی نہ تھا۔ اب دھوپ تیز اور ہوا معتدل ہونے لگی تھی اور زرہ بکتر جلنے لگی تھے اور پانی کی چھاگلں خالی ہونے لگی تھیں اور ملکہ کا ”آبدار خانہ“ لشکر کے ساتھ کچھڑ چکا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر ملک شاہ سلجوقی کی دیران رصد گاہ کے سامنے اتر پڑا جو لاتعداد کھجوروں کی چھتریوں میں منہ چھپائے کھڑی تھی۔

اس کی اکثر چھتیں گر چکی تھیں، دروازے نکل چکے تھے اور فرش کے نقش پتھر

غائب ہو چکے تھے۔ داخلے کی محراب میں لوہے کے بجائے کانٹے دار جھاریوں کا دروازہ کھڑا تھا جسے اس نے تلوار سے گرا دیا۔ اس کے ارد گرد سواروں کو پھیلا کر اندر داخل ہوا اور لق و دق محن میں اتر پڑا۔ اس کے وسط میں آٹھ دس میڑھیوں کے نیچے باؤلی کا سبز پانی مردہ پڑا تھا اور اس کے چاروں طرف چبوتر تھا جس پر کنیر اور کھجور کے درخت تھے اور ہر چار طرف بھورے پتھر کے کوشک اور دو ہرے دالان اور صمبیاں تھیں جن کی چھتیں گر چکی تھیں یا گرنے کا انتظار کر رہی تھیں اور اب جن میں کبوتر اور بابائیلیں پڑاؤ کئے ہوئے تھیں اور ملک شاہ سلجوقی کو دعائیں دے رہی تھیں۔ داخلے کی محراب پر بھاری قتبہ تھا جس کے بیٹھے ہوئے زینے پر وہ تلوار ٹیک کر چڑھ گیا۔ قتبہ سلامت اور خشک تھا۔ وہ نیچے اتر اور اپنے گھوڑے محراب میں اس طرح دھانس کر باندھ دیئے کہ وہ زندہ بچا نک ہو گئے۔ ایلیس نے کنیر کی گھنی چھاؤں میں چارہ بچھادی اور ملکہ کا بکتر کھولنے لگی۔ ملکہ زرد بھل کا زبر جامہ پہنے اٹھتے آفتاب کی چڑھتی گرمی میں وسیع و عریض باؤلی کے ٹھنڈے ہرے پانی کو گھور رہی تھی اور آستین چڑھا رہی تھی اور وہ ان کے جسم کی قاتل گولائیوں میں کھو گیا تھا۔ پھر وہ بیدار ہوا اور ایلیس سے اپنا بکتر کھواتے ہوئے بولا۔

”اگر ملکہ عالم غسل فرمائیں تو میں ہٹ جاؤں۔“

ملکہ عالم اپنے سرخ بالوں کی ریشمی رستی کھول رہی تھیں۔ وہ اپنا بکتر ایلیس کے حوالے کر صرف تلوار لے کر باؤلی میں اتر گیا۔ گھوم کر دیکھا کوئی صورت اس کے سامنے نہ تھی۔ اس نے اطمینان سے وضو کیا اور کنکھیوں سے ملکہ عالم کے بدن کو دیکھا ہوا محراب میں آیا، اپنے اہلیق کی گردن چھپھپھائی اور اسی کا زین پوش لے کر قتبہ پر چڑھ گیا۔ تھوڑی دیر وہ اس برفضا مقام پر سکوت کے عالم میں بیٹھا رہا۔ پھر کبوتروں کی بیٹ سے سفید فرش پر زین پوش بچھا کر نماز کے لئے کھڑا ہو گیا۔ اتنے دنوں بعد خدا کے حضور میں پہنچا تو خشت الہی کا غلبہ ہوا اور وہ بڑی دیرینک روتار ہا اور پوری محویت کے ساتھ نفلیں پڑھتا رہتا۔ معلوم نہیں کب تک پڑھتا رہا۔ ایک بار اس نے سلام پھیرا تو ملکہ سامنے کھڑی تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھورتے رہے۔ جب نگاہوں میں تحیر کی جگہ اجنبیت اور بے اعتمادی بڑھنے لگی اور ملکہ کے بھیگے سرخ بالوں سے دھمکتی ٹپک کر ان کی نیلی آنکھوں

کی لمبی پلکوں پر تھر تھرانے لگے اور وہ پلکیں جھپکاتے لگیں۔ تب اس نے بیٹھ سی بیٹھے اپنے سامنے سے تلوار اٹھائی اور اسے ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔ ملکہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر دھیمے اور تلخ لہجے میں پوچھا۔

”تم..... تم مسلمان ہو؟“

اس نے گویائی کی ساری طاقت سمیٹ کر بھاری اور مضبوط آواز میں جواب دیا۔

”ہاں خدا کا شکر ہے کہ ہم اس کے بچے دین اسلام کے نام لیا ہیں۔“

”جھوٹے بھی ہو۔“

”غدار بھی ہو۔“

”جاسوس بھی ہو۔“

انھوں نے دیوار کا سہارا لے لیا تھا اور کانپنے لگی تھیں اور ان کی آواز تھرا گئی تھی۔

”ملکہ عالم..... ہمارے کان ایسے خطابات سننے کے عادی نہیں۔ اگر ان الزامات

میں سے کوئی بھی صحیح ہوتا تو آپ جام بہشت کے کنارے شیر کا لقمہ بن چکی ہوتیں۔“

”نہیں تم نے وہ خدمت ہماری نگاہ میں اعتبار حاصل کرنے کے لئے انجام دی۔“

تم نے اس شجاعت کی بہت بڑی قیمت وصول کی..... تم نے مغرب کی ایک جلیل المرتبت

ملکہ کی ناسوس کے لئے سازش کی..... تم نے جون دی نائٹ بن کر ہمارے شب خون کا منصوبہ

مٹی میں ملا دیا۔ تم نے دمشق کے محاصرے میں ہمارے جزائر لشکر کو دعا دی اور اسے پیاسا

مار دیا۔ اور اب.....“

”اب ہمارا خیال ہے کہ ہم جون دی نائٹ کے شامی سواروں کی حراست میں

ہیں۔ وہ وقت دزد نہیں جب ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہوں گی اور ہم گندے اونٹ پر

سوار دمشق کی ناپاک گلیوں میں گشت کر رہے ہوں گے..... اور شیر کوہ یورپ کو ذلیل کر دینے

والی شرطوں کا سودہ رقم کر رہا ہوگا۔“

”قبل اس کے کہ بیان کئے ہوئے اندیشوں میں سے کوئی اندیشہ مکمل ہونے کی

جسارت کرے..... قبل اس کے کہ ملکہ عالم کے ناچیز سواروں کے گھوڑوں کی طرف کوئی

ناپاک ہاتھ بڑھے..... قبل اس کے کہ ملکہ عالم کے راستے پر کوئی بے ادب نگاہ اٹھے ہمارا

سر آپ کے قدموں میں لوٹنا ہوگا۔“

یہ کہہ کر اس نے تلوار بے نیام کر دی جس کی جھنکار سے تہہ گونج گیا اور ناسوس کی

طرح گھٹنوں پر گر کر تلوار کے پھل کو بچ سے چوم کر دونوں ہتھیلیوں پر رکھی اور اسی طرح بیٹھا

رہا۔ ملکہ اس کا چہرہ پڑھتی رہیں اور آنسوؤں کے قطرے ان کے رخساروں پر رزنے لگے۔

”ملکہ عالیہ مسلمان اپنے دین کے بعد اپنی تلوار کی ناسوس کے لئے جیتا اور مرتا

ہے۔“

ملکہ نے تلوار اس کے ہاتھوں سے اٹھا کر نیام کر دی اور جانے کے لئے مڑیں۔

اس نے اٹھ کر بازو پکڑ لیا اور اس نے دیکھا کہ جنت کی سب سے حسین حور زرد چٹکی لباس

پہن کر اس کے سینے سے لگ گئی ہے۔ وہ اسی طرح کھڑے رہے۔ کئی ایک بیت گئے کئی

صدیاں بیت گئیں۔ جس کے پاس جتنے آنسو تھے اس نے ٹپا دیئے۔ جب آنکھیں سوکھ گئیں

اور ملکہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ دونوں مسکرا دیئے۔ معصوم بچوں کی سی بے لوث، بے

ساختہ مسکراہٹ بھی کتنی مہنگی ہوتی ہے جو کسی کسی کو اور کبھی کبھی نصیب ہوتی ہے۔

شام قریب تھی اور وہ دمشق سے دور تھے کہ ایک لشکر طلوع ہوا جس کے سر پر فرانس

کا پرچم سایہ کئے ہوئے تھا۔ سپہ سالار ملکہ کو سلامی دے کر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

ہمارے لشکر نے محاصرہ اٹھا لیا ہے اور حمص تک پہنچے ہٹ گیا ہے۔ آپ ہماری

رہنمائی میں تشریف لے چلیں۔“

ملکہ نے داہنے ہاتھ پر جمیل کرتے گھوڑے پر سوار اور دھوپ میں جگمگاتے بکتر

میں لمبوس جون دی نائٹ کو دیکھا تو اس نے آنکھیں جھکا لیں۔ جب وہ حمص کے نیچے صلیبوں

کی قیام گاہ میں پہنچا تو معلوم ہوتا تھا کہ مردے قبر سے نکل آئے ہیں۔ اجڑے ہوئے تاریک

خیموں میں سپاہی غلے کی بوریوں کی طرح دھنسے پڑے تھے۔ دھندلی دھندلی آگ کی روشنی

میں..... وحشت ناک ٹمٹاتی آنکھیں پھاڑے ایک دوسرے کے دل میں جھانک رہے

تھے۔ ایک ایک تلوار کے بدلے ایک ایک روٹی مانگ رہے تھے اور مردہ گھوڑوں کا گوشت

بھون رہے تھے۔ ننگے جسموں سے تیز نکالے جا رہے تھے جیسے مچھلی کے قتلوں سے کانٹے

کھینچے جاتے ہیں۔ ایک آدمی ایک زخمی کی چھانگل کھول رہا تھا اور وہ صبح کا واسطہ دے کر ایک

گھونٹ پانی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ اس کے آگے پیچھے چلنے والے سوار اپنے گھوڑوں سے کچلے جانے والوں کی فریادوں کے لئے بہرے ہو گئے تھے۔ کوزیڈ اور لوئی ہفتم حمص کے قلعے میں مقیم تھے۔ بیرونی حصہ کوزیڈ کے قبضہ میں تھا اور اندرونی عمارتوں پر لوئی ہفتم کا عمل دخل تھا۔ تیسری منزل کا ایک ہشت پائل برج اس کی حفاظت میں دیا گیا ہے خبر گرم تھی کہ مسلمانوں کا تازہ دم لشکرات کو ہار داکرے گا اس لئے بھوکے پیاسے زخمی شکست خوردہ ایک لاکھ کے لشکر کو کربستہ رہنے کا حکم تھا۔ وہ سوکھے گوشت کے ٹکڑے اور لکڑی کے مانند سخت بسکٹ پانی کے ساتھ نگل کر اور دیوار سے ڈھال لگا کر نیم دراز ہو گیا اور اپنے اس خوف کو بھگانے کی کوشش کرنے لگا جو اس کے دل پر منڈلا رہا تھا۔

اس رات جب وہ تیسری منزل کی تمام برجیوں کا چکر کاٹ کر اپنے خیمے میں بھیجی ہوئی شام کی جوان چاندی پر بیٹھا تھا اور سنسان صحن کے اس پار نیم روشن دالانوں میں پیہرہ دیتی ہوئی عورتوں کے سائے انسانی ستونوں کی طرح ساکت ہو گئے تھے اسی وقت اس نے ایک پرچھائیں دیکھی جو اپنے سیاہ لبادے کے دامنوں کو زمین پر ڈالے ہوئے وقار کے ساتھ اس کے برج کی طرف آرہی تھی۔ ان کے آتے ہی اس نے ان تمام دروازوں پر پردے ڈال دیئے جو عمارت کے دوسرے حصوں سے نظر آتے تھے۔ صرف ایک دروازہ جو نیچے چوڑی چکنی خندق کے سامنے تھا، برہنہ رہا۔ اس کے راستے سے برج کے فرش پر چاندنی کا پتلا سا بستر بچھا رہا۔ پھر اس نے اپنے رستہ پوش ہاتھوں سے سینے پر ڈھیر ریشم کے کپڑوں کو اٹھایا تو ملکہ کی آنکھوں، رخساروں اور صلیب کے ہیروں نے سارے برج کو منور کر دیا۔ پھر ان کی آواز کے ترنم سے سارا برج کھٹکنے لگا۔

”تم کون ہو..... کہاں کے ہو..... کیا ہو..... اپنے خدا کی قسم ہم کو بتلاؤ۔“

”ہمارا نام یوسف ہے۔“

”اور؟“

”ہم والی دمشق کے ولی عہد ہیں۔“

”اور؟“

”اور؟..... اور یورپ کی ایک عظیم الشان ملکہ کے ناچیز.....“

ملکہ کے ہاتھوں نے اس کے ہونٹوں کو جملہ مکمل کرنے کی اجازت نہ دی۔

”تم مشرق کے کس شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہو؟“

”مشرق کے شاہی خاندانوں کی ماں تلوار ہوتی ہے جو ہماری کمر میں موجود ہے

اور جس پر ہمارا حق محفوظ ہے۔“

”نہیں، تم عرب ہو یا سلجوقی..... عباسی ہو یا فاطمی؟“

”ہم گرد ہیں جنھوں نے عرب پر گھوڑے اٹھائے ہیں اور عجم پر جھنڈے اڑائے

ہیں۔“

”تم جانتے ہو کہ ہم کون ہیں؟“

”آپ کے لئے یہی سب سے بڑا شرف ہے کہ ہم آپ کے.....“

دمشق کے مشہور عالم گلابوں سے کہیں نازک ہاتھ نے اس کو روک دیا۔

”ہماری ذاتی ریاست“ ایٹلیک“ فرانس کی سلطنت سے کہیں بڑی ہے، زرخیز

اور آباد ہے۔ فرانس کا تخت“ ایٹلیک“ کا محتاج ہے۔“ ایٹلیک“ کا تخت فرانس سے بے

نیاز ہے۔ ہم چاہتے ہیں..... اس تاریکی میں کوئی ستون ہماری جاسوسی تو نہیں کر رہا ہے؟“

اس نے ملکہ کو سینے سے الگ کیا۔ تلوار کھینچ کر باہر نکلا، ہر طرف سے اطمینان کر

کے واپس آیا۔

”ہماری آرزو ہے کہ تمہارے سوا کوئی آرزو نہ کریں۔“

”کیا چھاپا ہوتا کہ تمہارے سر پر“ ایٹلیک“ کا تاج ہوتا اور تمہارے قدموں میں

”ایٹلیک“ کا تخت۔“

”لیکن ملکہ عالم۔“

”مذہب تمہاری ذاتی چیز ہے جسے تم اپنی ذات کی تہائی تک محدود رکھ سکتے ہو۔“

”یہ کیسے ممکن ہے؟“

”بادشاہت کے دوسرے ناگوار لوازمات کی طرح چند مذہبی رسوم کی ظاہری بجا

آوری بھی برداشت کی جاسکتی ہے۔“

”لوئی؟..... لوئی کو پرانے تاج کی طرح تبدیل کیا جاسکتا ہے۔“

”لیکن تم چپ ہو۔“

”تم بولتے کیوں نہیں؟“

”بولو..... تمہاری بھیا نک خاموشی سے ہماری ہڈیاں پگھلی جاتی ہیں۔“

”تم خاموش ہو..... محبت ایک لفظ ہے جسے زبان کی ایک حقیری لغزش ادا کر دیتی

ہے لیکن اس پر ثابت قدم رہنا بڑے بڑے بادشاہوں کے لئے بھی دشوار ہے۔“

”یوسف..... اگر تم مشرق میں ایک سلطنت پیدا کر سکو اور ہم کو مذہب کی ذاتی

آزادی دینے کا وعدہ کرو تو ہم مغرب کا ایک جلیل المرتبت تاج اتار کر ایشیائی گورنر کے

چھوٹے سے دلی عہد کی سوتی پگڑی قبول کر سکتے ہیں۔“

”تم اسی طرح ساکت ہو..... لوئی کا خیال تھا کہ ہم آدمیوں کو پرکھنے میں اپنا ثانی

نہیں رکھتے..... لیکن آخر کار اس کی بہت سی باتوں کی طرح یہ بات بھی ناقابل قبول ہوئی۔

ہم نے جب تم کو دیکھا تو محسوس کیا کہ ہم نے جس چیز کے لئے ایشیا میں نزول فرمایا تھا وہ

میسر آگئی۔ جب تم نے ہمارے ذاتی رسالہ داروں کا شاندار لباس زیب تن کیا تو اس خیال کو

اور تقویت ہوئی اور جب تم نے خالص ایشیائی شہزادوں کی جلالت کا اظہار کر کے ہماری

زندگی کا سب سے بڑا شیر گیدڑ کی طرح شکار کیا تو ہمیں لوئی کے قول پر الہام کا دھوکا ہوا اور

اپنی نگاہ پر ناز لیکن.....

”لیکن اس وقت انکشاف ہوا کہ ہم نے چاندنی سے قبا تراشنے کی کوشش کی تھی،

ہم نے سنگین مجسموں سے رقص کی فرمائش کی تھی، ہم نے ایشیائی افسانوں کو حقیقت میں بدل

دینے کا خواب دیکھا تھا۔“

”ملکہ عالم۔“

”مشرق کے گورنر کے دلی عہد، ہمارے دیس کی کنواریاں دغا باز عاشقوں کا

خون پلایا کرتی ہیں لیکن تم۔“

”ملکہ عالم..... تاج بادشاہوں کے لئے اتارے گئے ہیں۔ اگر کوئی بیوقوف سپاہی

اپنے سر پر رکھ لیتا ہے تو تاج کا کچھ نہیں بگڑتا سپاہی کی گردن تلوار کا غلاف ہو جاتی ہے۔“

”تمہاری صورت کی طرح تمہاری زبان میں بھی جادو ہے۔ کاش.....“

جملہ مکمل ہونے سے قبل برج ان کی خوشبودار روشنی سے خالی ہو گیا اور پہلی بار

اسے اپنی غربت کا احساس ہوا۔ ایسی غربت جو بادشاہت سے کم پر خفا مند نہیں ہو سکتی۔

پہلی بار اسے اپنے سینے میں خنجر سا تیرتا محسوس ہوا۔ وہ درد کی شدت بلبلاتا اٹھا اور برج کے

باہر نکل آیا۔ دور کو شکوں کے دونوں سروں پر نیزوں کے اثر ہے مشغلوں کی زبان نکالے

کھڑے تھے جن کی دھندلی روشنی میں مسکح عورتیں پرچائیوں کی طرح ستونوں سے لگی کھڑی

تھیں۔ اندر آ کر اس نے خود، بکتر اور دستانوں کے کانٹے درست کئے۔ نیزہ اور ڈھال سنبھال

کر نیچے آیا۔ وہ پہرہ داروں کی سوالیہ نگاہوں سے بے نیاز اصرطیل پہنچا، اپنے گھوڑے پر اپنے

ہاتھ سے ساز رکھ کر سوار ہو گیا۔ ملکہ عالم کے محافظ نائٹ کی سواری دیکھتے ہی درگاہوں نے

پھانک کھول دیا۔ حمص سے نکلتے ہی ہر قدم پر دل اس کی باگ پکڑ لیتا اور انا نیت آگے ڈھکیل

دیتی۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ وہ حمص کے قلعہ کی فصیل پر چڑھ رہا تھا۔

کمر بستہ لشکر سارا دن یروخلم کے بادشاہ اور کرک کے رنجینا لڈ کی ملک کا انتظار

کر رہا۔ تمام دن شہنشاہ کو زید، لوئی ہفتم، ملکہ ایلینور، راب، شہزادے، نائٹ، پادری اور

فوجی سردار دمشق پر حملے کا منصوبہ بناتے رہے اور وہ دن بھر ملکہ کے کمرہ خاص کی محراب میں

ہتھیار پہنے کھڑا رہا۔ ساری رات وہ سوتے میں جاگتا رہا اور جاگتے میں سوتا رہا اور ملکہ کے

چہرے کی ایک جھلک کے لئے ترستا رہا۔ دوسرے دن کے غروب ہوتے ہوئے افرنجیوں

کے ڈھول گر جے لگے، ترنا چننے لگے۔ پہلے وہ بھی یہی سمجھا کہ شاہ یروخلم کی پیشوا کی ہو رہی

ہے۔ پھر انکشاف ہوا کہ دمشق کا شامی لشکر حرکت کر رہا ہے اور پچاس ہزار سوار حمص کو تین

طرف سے گھیرے ہوئے بڑھ رہے ہیں جن کے پیچھے بغدادی دبا بے اور صلیبیوں سے چھینی

ہوئی تختہ قیاس ہیں۔ آرام سے آراستہ فوجیں انھیں اور گھوڑوں کی موجوں پر سوار ہو گئیں۔

آگے آگے لوئی ہفتم خالی سوزوں پر ہمیز لگائے حمل کی قبا پہنے، ننگے سر فرانسسی لوہوں اور

نائٹوں کے جھرمٹ میں نکلا۔ اس کے پیچھے فرانسیسی افواج تھیں۔ اس کے اور کو زید کے لشکر

کے درمیان صلیب مقدس تھی جسے ستاروں کی طرح حسین کنواریاں اور فرشتوں کے مانند

پڑجلال پادری اٹھائے ہوئے تھے جو آنسو لٹا رہے تھے اور بائبل کی آیتیں پڑھ رہے تھے۔

ان کے پیچھے طلائیہ کے سوار تھے جو تیر انداز میں شہرت رکھتے تھے۔ ان کی کانوں پر چڑا

چڑھا ہوا تھا اور پیٹھ پر تیروں کے گھڑتھے۔ وہ آج بھی ملکہ کے پہلو اور مسلح عورتوں کے جلوس میں گھوڑا گھوڑے کو زقہ لگا رہا تھا کدرا ہوا تھا۔ انہوں نے سرعت کے ساتھ دریائے اردن پار کیا اور اس کے مغربی کنارے پر پھیل کر مورچے بنانے لگے۔ یروشلم، صور، عکہ اور عسقلان سے آئے ہوئے خیمے کھڑے کئے کیونکہ محاصرہ دمشق ہی کے زمانے میں شیرکوہ نے صلیبیوں کی ساری قیام گاہ لوٹ لی تھی اور پھونک دی تھی۔ اور یروشلم کے بار بردار اونٹوں سے اتاری ہوئی غذا تقسیم ہوئی۔ ملکہ نے لوئی سے دور بارگاہ صلیب کے سائے اور اپنی نگرانی میں اپنے خیمے نصب کرائے اور خواب گاہ کی پشت کی چھو لداری اسے عنایت کی۔ ہر طرف سے مطمئن ہو کر اس نے خنجر سے منہ دے کی دیوار چاک کی اور اس کے پلنگ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا جس کے پائے نیچے اور بستر گھر در تھا۔ چھوٹے نیزے کے برابر شمع کی تیز روشنی میں ملکہ اسے خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے گھٹنوں پر جھک کر دونوں ہاتھوں میں ملکہ کا ہاتھ تھام لیا۔ گرم، ملائم، سفید، خوشبودار ہاتھ جس کا لمس اس کی روح میں سرایت کر گیا تھا۔ پھر اس نے بہشت کا وہ زندہ گلاب اپنی آنکھوں میں رکھ لیا۔

”ہمارے لئے کیا حکم ہے۔“

ملکہ نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

”حکم یا مشورہ۔“

ملکہ نے اس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا۔

”ہمارا مشورہ ہے کہ تم واپس چلے جاؤ۔ دمشق پر ناکامی میں کوزیڈ کو تمہارا ہاتھ نظر آیا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ تمہاری موت ہمیں کوزیڈ کے خلاف تلوار اٹھانے پر مجبور کر دے اور آپس میں لڑتے ہوئے صلیبی لشکر غلام ہو کر دمشق کے بازاروں میں بک جائیں۔“

”بس یا اور کچھ؟“

”ہاں ہماری دعا ہے کہ تم صحیح سلامت دمشق پہنچ جاؤ۔ کسی آہو چشم نمازی بنت عم سے شادی کر لو۔ لڑکے پیدا کرو اور بوڑھے ہو جاؤ اور قصر دمشق کے خنک دالانوں میں موذب بیٹھے ہوئے پوتوں، نواسوں سے جب دوسری صلیبی لڑائی میں اپنے کارنامے بیان کر دو تو تمہاری آواز زندہ جائے تمہاری آنکھیں بھیگ جائیں اور تم طلائی کام سے مزین آستینوں

سے آنسو پونچھ کر اٹھ جاؤ اور شہوت کی چھاؤں اور گلاب کی جھاڑیوں کی آڑ میں بچھی ہوئی سب ساق کی کرسی پر بیٹھ کر روتے رہو اور جب تمہاری بے گناہ خادمہ نارگیلی اور نیڈلے کر حاضر ہوں تو تم ان پر برس پڑو اور تمہاری تنہائی کی حفاظت پر زریں مکر خواجہ سرا ہلالی تلواریں علم کر کے کھڑے ہو جائیں۔“

پھر کوئی آواز نہ آئی..... دیر تک کسی کوزبان ہلانے کا یا راندہ رہا۔

”یوسف..... اگر تمہارے ہاتھ تھک جائیں اور تلوار پر رنگ چڑھ جائے تو ہمارے

پاس چلے آنا۔ مسیح کی قسم۔ ہمارے قصر کے دروازے تمہیں خوش آمدید کہنے کے لئے عمر بھر کھلے رہیں گے..... عمر بھر کھلے رہیں گے۔“

”ہم صبح سویرا ہو کر نکلیں گے، اردن کے کسی سنسان گھاٹ پر کوئی بہانہ کر کے تم کو

اترنے کا حکم دیں گے۔ وہ گھڑی..... وہی گھڑی ہماری جدائی کی گھڑی ہوگی۔“

باقی تمام رات ایک دوسرے کو دیکھنے اور دیکھنے والی آنکھوں کے دیکھنے میں

کٹ گئی۔

اب سامنے دریائے اردن بہہ رہا تھا۔ اس کے مشرقی کنارے پر جنگلی درختوں کا گنجان خاموش جنگل گھرا تھا۔ ملکہ کی ذات خاص کا رسالہ علموں اور بیروتوں کی چھاؤں میں پیچھے کھڑا تھا جن کے ہتھیار اور بکتر دھوپ میں جگمگا رہے تھے۔ ان کے آگے خود ملکہ کھڑی تھی جس کے خود کی کلفتی کے ہیرے دھوپ میں تڑپ رہے تھے، صلیب دمک رہی تھی اور سرخ آنکھیں سفید گھوڑے کی شعلہ رنگ کلفتی پر جمی ہوئی تھیں۔ ان کے بائیں دستانہ پوش ہاتھ میں گھوڑے کی سنہری زنجیر تھی۔ داہنے ننگے ہاتھوں میں سونے کا عصا تھا جس کے سر پر یاقوت کا تاج تھا اور بدن پر جواہرات جڑے تھے۔ گھوڑا دم کو چنور کر کے گردن جھکاتا تو ملکہ کی تلوار کا زریں نیام گھوڑے کی آہنی پاکھر سے ٹکرا کر بج اٹھتا۔

”جون دی نائٹ۔“

”ملکہ عالم۔“

”دریا اتر کر جاؤ اور دشمن کی خبر لے کر آؤ۔“

وہ اپنے بکتر اور تلوار کو کھڑا کرتا ہوا ابلق سے نیچے اتر اور مشرق کے بادشاہوں

کی طرح باوقار قدم رکھتا ملکہ کی سیدھی زریں رکاب کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ سرخ بوجھل، بغیر آنسوؤں کے روتی آنکھوں سے ملکہ کو دیکھا۔ نیام سے تلواریں نکالی اس پر بوسہ دیا اور نیام کر لیا، ملکہ نے جو آب بھی گھوڑے کی کھنی دیکھ رہی تھیں اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے ننگے ہاتھ تھراتے ہاتھ کی پشت پر ہونٹوں کے انگارے رکھ دیئے اور بے ادبی کی حد تک تاخیر کرتا رہا۔ پھر اٹنے قدموں چل کر اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ نصف دستہ صفوں سے نکل کر اس کے گھوڑے کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ ملکہ نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا اور آخری بار سماعت کو لالہ زار کر دیا۔

”مسلمانوں کے ایک لشکر کے لئے جون دی نائنٹ کافی ہے۔“

سوار اپنی جگہ قائم رہے۔ وہ گھوڑے کو ترچھا چلاتا ہوا خود کے چبچے کے سائے سے ملکہ کو دیکھتا ہوا اردن میں اتر گیا۔ کنارے پر پہنچ کر گھوڑا پھیر دیا اور اسے اٹنے قدموں ڈھکیٹا ہوا ملکہ کو اسی جگہ، اسی طرح دیکھتا ہوا درختوں کے جھوم میں کھو گیا۔

اس نے اہلق کی لگام ڈھیلی کر دی۔ جنگلوں اور گھاٹیوں کے چور راستوں پر وہ چکاروں کی طرح طرارے بھرنے لگا۔ پھر وہ اس دمشق میں داخل ہوا جو ایک لمبے چوڑے بیمارستان (شفابخانہ) کی طرح کراہ رہا تھا۔ دواؤں کی بدبو مریض زخیموں کی طرح گلی گلی اور کوچہ کوچہ لنگراتی پھری تھی۔ گنجان بازاروں کی چہل پہل قبرستانوں میں بیٹھی عود اور لوبان سلگ رہی تھی۔ مکانوں میں مینوں کے بجائے شہیدوں کی یادیں آباد تھیں۔ کوئی چھت ایسی نہ تھی جہاں سے فاتحوں اور نیازوں کا یہ پوش دھواں نہ اٹھ رہا ہو۔ وہ اپنوں اور بیگانوں سے مل کر قصر دمشق کے سامنے دور تک پھیلے ہوئے میدان کی طرف چلا جہاں عیسائی زخیموں کا ملبہ اور قیدیوں کا انبار پڑا تھا اور جن کا مقدر جنگی مجلس کے احکام کے انتظار میں سر بہر تھا۔ ان ہی کے قریب فرانس کے دبا بے، آسٹریا کی منجھتیں اور جرمانیہ کے ہتھیار ڈھیر تھے۔ اس نے کسی نہ کسی طرح وہ زرد خیمہ جس کے سائے میں بلیٹیو رنے چارہ گری کی تھی حاصل کیا۔ وہ نمکیرہ مانگ لیا جس کے نیچے اسے ٹائٹ بنایا گیا تھا۔ وہ سامان خرید لیا جو ایلینو ر کے جسم کے لمس کا امین اور اس کی پہلی محبت کا راز دار تھا، لیکن کسی چیز نے اس کے زخموں پر مرہم کا کام نہ کیا۔ دل کی دیرانی اور بے قراری اسے اس غم کے حضور میں لے گئی جو اپنی ذات کی شکست سے پھونتا ہے، لیکن آہنی شخصیتوں کے آسمانی حوصلوں سے نمو پا کر ساری کائنات پر چھا جاتا

ہے اور اس عظیم الشان میلے میں انسان اپنی ذات کوٹو نے کھلوانے کی طرح بھولی جاتا ہے اور ستاروں کا شکار کھیلتا ہے، ہاتھابوں پر کندالتا ہے اور آفتابوں پر گھوڑے اٹھاتا ہے۔ جب اسلامی سلطنت کے سرحدی شہروں سے آنے والے بد نصیبوں کی تعداد بڑھتی گئی اور ان کے ساتھ آئے ہوئے خوئی افسانوں کی سفاکی نے یقین کو زخمی کر دیا تب اس نے غنیمت میں آئے ہوئے ایک جرمن گھوڑے پر سوتی چار جاہ رکھا اور خود رومانیہ کے راہب کا زعفرانی چغہ پہنا اور آنسوؤں کی صلیب گگے میں ڈال کر شاہک کی طرف کوچ کیا۔ شاہک کو سیراب کرنے والی تین نیزوں کے برابر چوڑی نہر زبیدہ کا چمکیلا پانی دیکھتے ہی گھوڑا اچھلنے اور ہنہانے لگا اور شہر کی سفید، بھوری اور سرخ عمارتوں کا سلسلہ نظر آنے لگا جیسے کھجور کے درختوں کے نیچے مصری قالین ٹانگ دیئے گئے ہوں۔ وہ پانی سے آسودہ تھا لیکن جانور کی دلدادہ کی خاطر اتر پڑا۔ نہر کے کنارے دس پندرہ شاہی مسلمان زردھاروں کی پرانی سیلی عبا میں پہنے بچے کھچے عماے باندھے ہاتھ منہ دھو رہے تھے، پانی پی رہے تھے۔ اس نے گھوڑے کو چھوڑا اور ہرے بھرے کثیر کے درخت سے مسواک توڑنے لگا۔ گھوڑے نے لپک کر منہ پانی میں ڈال دیا کہ ایک طرف سے ہتھیاروں کے کھڑکھڑانے اور گنگٹانے کی آواز آئی۔ ایک ٹائٹ زرد بکتر پہنے (جس کے سینے پر سرخ عقاب، بانیں شانے پر جھلوتی ہوئی بھاری ڈھال پر سیاہ صلیب کا نقش تھا) خود سے گز بھر گنگٹانے زرد باندھے گھوڑے پر سوار مسج کے گیت کا قصیدہ گاتا چلا آ رہا تھا۔ ٹائٹ نے اس کو دیکھ کر سینے پر صلیب بنائی۔ اسی وقت نہر کے کنارے آدمیوں اور گھوڑے پر نظر پڑی۔ ٹائٹ اپنا راستہ چھوڑ کر نہر کے پشتے پر چڑھ گیا اور مسلمانوں پر گھوڑا ریل دیا اور تلواریں کھینچ کر ان پر ٹوٹ پڑا۔ وہ ذبح ہوتی ہوئی بھیڑوں کی طرح چلانے لگے۔ اچھے خاصے ہاتھ بیروں کے دس بارہ آدمیوں سے یہ بھی نہ ہوسکا کہ بھاگ کر ہی اپنی جان بچالیں۔ وہ چار چھ قتل کر کے بقیہ کو زخمی کر کے ان کے پاس آیا۔

”مقتدس باپ ان پلید مسلمانوں نے بہاؤ پر بیٹھ کر اپنا نجس پانی آپ کے گھوڑے کو پلایا ہے۔ اس کے لئے طبقہ راؤ دیہ کا ٹائٹ آپ سے معافی مانگتا ہے۔“

اس نے بھر سینے پر صلیب بنائی اور بائیں کی آیتیں پڑھتا چلا گیا اور وہ اسی طرح منہ میں مسواک دبائے جسم حیرت بنا کھڑا رہا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے زخمی سنگین زخیموں

اور مردوں کو رو دھو کر لادے گئے اور جب وہ ہوش میں آیا تو رات بڑھنے لگی تھی اور ہوا خنک ہو چلی تھی اور گھوڑا اس کے سامنے کھڑا منہ کا لوہا چارہ ہاتھ۔ اس نے اٹھ کر گردن پر تھکی دی اور سوار ہو کر شہر کی طرف چلا جس کے چراغوں سے جگنو چمکتے نظر آ رہے تھے۔ وہ بستی کی تنگ و تاریک پتھر ملی گلی سے گزر رہا تھا کہ ایک مکان کے دروازے سے چراغ کی روشنی کی تھر تھراتی دھاری نظر آئی۔ اس نے گھوڑا روک لیا اور سیڑھیوں پر چڑھ کر دیکھا۔ ایک آدمی تھر تھراتی دھندلی روشنی میں مٹی کے ڈھیر کی طرح بیٹھا بکری دودھ رہا تھا۔ چاہے پروہ کھڑا ہو گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے راہب کو دیکھ کر سینے پر صلیب بنانے لگا۔ اس نے مطمئن ہو کر مسیح کی رحمت کا یقین دلایا۔

”تم پر مسیح کی رحمتیں نازل ہوں..... مجھے آج کی رات اتنی جگہ دے دو کہ کر سیدھی کر لوں۔“

”یہ..... یہ تو ہماری نجات کا سبب ہو گا مقدس باپ“

لیکن اس کی آواز پر بدحواسی کا عکس تھا اور چہرے پر مصیبت ٹوٹ پڑی تھی۔ اس کو بڑی حیرت ہوئی۔ پھر وہ اس کے ساتھ مکان میں داخل ہو گیا۔ صحن کے ایک طرف دالان میں چراغ جل رہا تھا۔ پلنگ پر ایک نسوانی سایہ دو بچوں کی پرچھائیاں سمیٹے بیٹھا تھا۔ وہ دوسری سمت کے دالان کے اس تخت پر بیٹھ گیا جس میں ایک پائے کی جگہ پتھر لگے تھے اور بیچ کے تختے نیچے جھک گئے تھے۔ پھر اس گھر میں بھونچال مچ گیا۔ اکلوتا چراغ لکڑی کا چراغ دان سمیت اس کے دالان میں آ گیا۔ دالان کے پردے کھول کر اس کے دالان کے دروں پر ڈال گئے۔ پلنگ پر کھجور کی چھال سے بھرا کپڑے کا گد اچھا یا گیا۔ گرم پانی سے اس کے ہاتھ دھلوائے گئے اور بکری کا دودھ، جو کی تازی روٹی اور خشک کھجوریں کھانے میں رکھی گئیں اور پھر اس کے گھوڑے کو اندر کے کوٹنگ میں باندھ کر دروازے پر چٹائیاں ڈال دی گئیں اور وہ لیٹ کر، کسبوں میں لپٹ کر آج کے مقتولوں کی تقدیر کے متعلق سوچتا رہا کہ جب ان کی لاشیں گھر پہنچی ہوں گی تو بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں پر کیا گزری ہوگی اور اس کے گھوڑے کو کیسی بد دعائیں دی ہوں گی۔ دوسرے دالان سے بچے کے رونے کی آواز آئی اور اس کے بستر کے قریب ایک جوان عورت آ کر کھڑی ہو گئی۔ مدھم روشنی میں بھی اس کی

آنکھوں سے پچا رنگی اور چہرے سے نامرادی ٹپک رہی تھی۔ اس نے اپنے کالے، لالے، کثیف کرتے کی کمر پر بندھی ہوئی بالوں کی رشتی کھولی اور سر کا رومال اتار کر کھوٹی پر ٹانگ دیا اور کرتے کے دامن پکڑ لئے جس سے اس کے گندی گداز گھٹنے چمک اٹھے۔

”کیا کرتا اتاروں؟“

”کیوں؟“ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

”میں..... میں آپ کی خدمت کے لئے۔“ اس کی آواز کا گاکا گھٹ گیا۔

”خدمت؟“

پھر پردہ اٹھا کر وہ ادھیڑ آدمی اندر آ گیا جس کی گود میں دو تین برس کا ایک مرگھلا لڑکا بلک رہا تھا۔

”قرآن مجید کی قسم میرے گھر میں یہی ایک بیٹی ہے..... جسے میں نے مقدس

باپ کی خدمت کے لئے بھیج دیا ہے۔ آپ اس بچے کی نگر نہ کریں۔ یہ اس کے پاس بھی روتا ہے..... یہ تو اس دن سے روئے جاتا ہے جس دن اس کا باپ اپنے آقا اور خدا کے بیٹے کے بچے خادم سے گستاخی کے جرم میں قتل ہوا ہے۔ یہ تو یوں بھی میرے پاس سوتا ہے۔ آپ سیکینہ کے ساتھ آرام کریں۔ سو جائیں..... میں، میں اسے لئے جاتا ہوں۔“

وہ بلبکتے ہوئے مری مری آواز میں روتے ہوئے بچے کو کندھے سے لگا کر باہر چلا گیا۔ وہ عورت اپنی کالی آنکھوں سے اس ہرنی کی طرح پردے کی دراز سے جھانکتی رہی جس کا بچہ گرفتار کر لیا گیا ہو۔ وہ بڑی دیر تک اپنے کسبوں میں لپٹا ساکت بیٹھا رہا۔ سیکینہ اسی طرح کھڑی رہی۔ پھر اس نے اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے وضو کیا اور نماز کے لئے کھڑا ہو گیا۔ سلام پھیرا تو دیکھا کہ سیکینہ کے پاس اس کا باپ کھڑا ہوا ہے اور اسے گھور رہا ہے اس نے اشارے سے ان دونوں کو رخصت کر دیا۔ رات لیٹے لیٹے کاٹ کر اندھیرے میں فجر کی نماز پڑھی اور اس گھر سے نکل بھاگا جس کے دروازے پر اسے کھائے جاتے تھے۔ جب وہ شاہک کے گرجا کی چمکیلی غلام گردش میں نہی ہوئی ساگون کی کرسی پر بیٹھا ہوا گر جا کے نگہبان سے پادری کے گھر کا پتہ پوچھ رہا تھا تب ایک مسلح سوار دروازے پر گھوڑے سے اتر اور اسے غور سے دیکھ کر اپنے ساتھ چلنے کی گزارش کی۔ شاہک کا عیسائی عامل بھورے پتھر کے شاندار محل کے

مخلیس سبزے پر کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ اس کی پشت پر ہتھیار بند سپاہیوں کا ایک دستہ کھڑا تھا اور قدموں میں سیکنہ کا باپ دوزخو بیٹھا ہوا تھا۔ والی شاہک نے کھڑے ہو کر تعظیم دی اور کرسی پیش کر کے بولا۔

”مقدس باپ اس کافر کو جانے ہیں؟“

”ہاں میں اسی کی تلاش میں دمشق سے نکلا تھا۔ مجھے پتہ چلا تھا کہ میری مسلمان کنیز جو شام کے ایک مجاہد کی بیٹی ہے اس کے یہاں رہ پڑی ہے۔ جب وہ مجھے اس کے گھر میں نظر نہ آئی تو میں نے مسلمانوں کے طریقے پر نماز پڑھ کر اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے اور اس کنیز کو عیسائی ثابت کر سرائ لگانا چاہا لیکن شاید مجھے غلط اطلاع ملی تھی۔

عاص نے گردن ہلائی اور مڑ کر سپاہیوں کو حکم دیا۔

”مقدس باپ پر مسلمان ہونے کا پلید اِزام لگانے کے جرم میں اس کی زبان کھینچ لو۔“

سپاہی اس کی طرف جھپٹے لیکن وہ بچ میں آگیا اور والی سے درخواست کی۔

”چونکہ اس آدمی نے میری خدمت کی ہے اور کھانا کھلایا ہے اس لئے میری خاطر اس کی خطا بخش دی جائے۔“ اور مقدس باپ کے سفارشی کلمات پر اس نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور سینے پر صلیب بنا تا بدخواست ہو کر بھاگا۔

”ان کتوں کو ہم نے اسی خدمت کے لئے زندہ رکھا ہے۔ ان کا فرض ہے کہ ہماری چاکری کریں۔ خیر آپ فرماتے ہیں تو درگزر کی جاتی ہے۔“

شاہک ہی میں اس نے اپنے اس گھوڑے کو بچ دیا جس پر کئی مسلمانوں کا خون تھا، جو کئی خاندانوں کی بربادی کا سبب بنا تھا اور جاڑے کا موسم شاہک کے قلعے اور مصافحات کی چونکیوں کے استحکام کی دیکھ بھال میں گزرا۔ موسم گرما کے طلوع ہوتے ہی اس نے ایک گدھا خرید اور کرک کی طرف چل پڑا جس کے رنجینا لڈ کاظم مسلمانوں میں طاعون کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ ابھی کرک پہاڑیوں میں گھرے ہوئے سفید مکانوں کے کنگرے ٹھیک سے نظر بھی نہیں آ رہے تھے کہ پشت سے گھوڑوں کی ناپوں کی آواز آئی۔ اس نے اپنے گدھے کو کنارے کر لیا۔ ایک ایک عیسائی سپاہی کے نیزے پر ایک ایک مسلمان کا سر خربوزے کی طرح ٹکا

ہوا تھا جس کی مردہ داڑھیاں خون سے لال تھیں۔ ایک سپاہی نے اسے دیکھ کر سینے پر صلیب بنائی اور مبارکبادیاں گانے والی آواز میں سروں کی طرف ابروؤں کا اشارہ کر کے بولا۔

”یہ بیچارے جنت جانا چاہتے تھے ہم نے ان کو جحیم کی مصیبت سے نجات دلا کر سیدھا جنت روانہ کر دیا۔“

پھر خود ہی اپنے مذاق پر اس زور سے ہنسا کہ دوسروں نے بھی ہنکار کی اور پہاڑیاں قہقہوں سے گونج گئیں۔ ہزار سروں کو نیزوں میں پروئے ہوئے یہ چھوٹا سا لشکر کرک میں داخل ہو گیا۔ وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے گدھے کو ڈپٹا ہوا چلا جا رہا تھا۔ کرک کے قلعہ نما گرجا کے سامنے لشکر اتر پڑا اور میدان میں نیزوں سے سرائار کر ڈھیر کر دیئے جس پر ڈھیروں بچے اور عورتیں ٹوٹ پڑیں اور ٹھوکروں سے الٹ پلٹ کر گنگنائی سرت کا اظہار کرنے لگیں۔ زندگی میں پہلی بار اس نے رنجینا لڈ کو دیکھا۔ وہ اونچے قد اور بھاری بدن کا جوان آدمی تھا۔ اس کی داڑھی بھوری تھی اور بال شانوں پر جھول رہے تھے اور آنکھوں میں بھینریوں کی سی چمک تھی۔ وہ زعفرانی عبا کی کمر پر چڑے کی بیٹی میں تلوار باندھے ہوئے تھا۔ گلے میں سونے کی صلیب، پیروں میں دو رنگے چڑے کے سوزے اور بھینر کی کھال کے بھدے جوتے تھے۔ وہ سروں کا ڈھیر دیکھ کر شیطانی ہنسی ہنسا اور بھینر کے سرخ گیندوں کو تلوار کی نوک سے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ پھر اس کی نظر پادری پر پڑی۔ اس نے سرور آواز میں مخاطب کیا اور قریب آ کر ہاتھ پر بو۔ سردیا اور عبادت خانے کے خادم کو حکم دیا۔

”آج کے جشن میں مقدس باپ کو نہ بھولنا۔“

جب اس نے بتایا کہ وہ دمشق میں پیدا ہوا ہے اور اب بیت المقدس کی زیارت کو نکلا ہے تو وہ بہت خوش ہوا اور دیر تک کھڑا شام کی سیاست پر گفتگو کرتا رہا۔ پھر ایک اونچے وحشی گھوڑے کے ایال پکڑ کر گنگائی پیٹھ پر سوار ہو کر نکل گیا۔ چرچ میں تیوہاروں کا سا جوش و خروش تھا۔ عورتیں بوڑھے اور بچے آتے اور سر کے بالوں، داڑھیوں، ناکوں، کانوں اور آنکھوں کو جوتے کی نوکوں اور بیٹیوں سے پھیلنے، حقیر فنی ہنستے اور واپس چلے جاتے اور ان کی جگہ نئے شائقین آتے اور یہی عمل دہراتے۔ وہ ایک حجرے میں دمشق کی واپسی کے متعلق سوچتا رہا۔ پھر معلوم نہیں کب شام ہو گئی اور چرچ کا خادم اس کے گدھے کی لگام پکڑ کر چلا اور اسے

رحیمینا لڈ کے بھورے پتھر کے بے ہنگم مکان کے بد وضع دروازے کے سامنے اتار دیا اور ایک دوسرا خادم اسے اندر لے گیا۔

عجلت میں جوڑے ہوئے چوکور ستونوں کے چوڑے برآمدوں کے سامنے پھر کے کھر درے چوترے پر چاندی کے کام کی ساگون اور آنسو کی بھاری بھاری کرسیاں بڑی تھیں۔ ان کے وسیع دائرے کے بیچ میں ایک اونچا سا تخت بچھا تھا۔ اس پر سنہری ریشمی چادر بڑی تھی جس کے حاشیے پر چاندی کے تاروں سے عربی اشعار کڑھے ہوئے تھے۔ کرسیوں کے بیچ میں چھوٹی چھوٹی تپائیاں رکھی ہوئی تھیں اور ادھر ادھر مثبت کار شدہ انوں میں موٹی موٹی تھوپلی ہوئی شمعیں جل رہی تھیں جن کی لوؤں سے کڑوے دھوئیں کی دبیز لکیریں اٹھ رہی تھیں۔ تانبے کی انگلیٹھیوں میں سلگتے ہوئے میلے نمبر سے خوشبودار چراغند پھیل رہی تھی۔ بیماریلی روشنی میں موصل اور حلب، دمشق اور قاہرہ کے محل اور اطلس سحاب کے کفتان پہنے سرخ منہ اور مضبوط ہاتھ بیروں والے آدمی بیٹھے تھے جن کی اجازت دہیوں سے بربریت نیک رہی تھی اور آنکھوں میں خون کی دھاریاں تیر رہی تھیں۔ رحیمینا لڈ نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا اور ان لوگوں کا تعارف کرایا جو طبقہ الدادیہ، ٹھیلر زاور ہاسپٹلرز کے نام لیوا تھے۔ وہ آپس میں فرانسیسی میں گفتگو کر رہے تھے اور اس سے کبھی کبھی لنگو فرنیکا میں مخاطب ہو جاتے۔ پھر رحیمینا لڈ نے تالی بجائی۔ ٹیکھے فطوط، کالی آنکھوں، کالے بالوں، میانہ قدوں، گداز جسون، گندی اور سفید سرخ رنگوں کی برہنہ عورتوں کا پرانکل کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ان کے بدن پر کہیں کہیں گلاب کی کیوں کے چھدرے چھدرے ہار لپٹے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں شربت کے جام، شراب کے مشکیزے، نقل کی کشتیاں اور چاندی کے پھیلے پھیلے منہ والے چھوٹے چھوٹے پیالے تھے۔ انھوں نے سب کے سامنے پلیٹیں جنیں اور انھیں نقل سے لبریز کیا اور پیالوں کو سرخ شراب سے چھلکا لیا اور محفل کی بد معاش نگاہوں اور شرمناک دست درازیوں کو جھیلی رہیں۔ اس کی کرسی کے پاس جو عورت کھڑی تھی اس کی طرف اشارہ کر کے رحیمینا لڈ نے نیگی آواز میں کہا۔

”مقدس باپ یہ مسلمان امیروں کی لڑکیاں ہیں جو صبح نے آپ پر حلال کر کے

اتاری ہیں۔“

وہ مسکرا کر بہانہ کر کے اپنی پلیٹ پر جھک گیا۔ زور چلتا رہا۔ پھر رحیمینا لڈ نے دو تالیاں بجائیں۔ ایک غلام جس کی لمبیں ترش ہوئی تھیں اور داڑھی بڑی نفاست سے کتری ہوئی اور ماتھے پر بعدوں کا نشان تھا میلا کفتان پہنے حاضر ہوا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے حکم ملا۔

”مار یہ کولاؤ۔“

ایک لڑکی لائی گئی۔ اسے بیچ تخت پر کھڑا کر دیا گیا۔ اس کا لباس اتار لیا گیا جیسے بکرے کی کھال کھینچ لی جاتی ہے۔ جیسے شمعوں کی روشنی تیز ہو گئی۔ محفل اپنے پہلوؤں میں کچلی ہوئی مجبور عورتوں کی لذت بھول گئی۔ اس کے نظارے میں کھو گئی اور رحیمینا لڈ کی آواز سے بھی نہ چوکی۔

”مقدس باپ دمشق سے آئے ہیں اس لئے عربی جانتے ہوں گے۔ یہ کجست سوائے عربی کے کچھ گانا ہی نہیں جانتی مگر آواز ایسی پائی ہے کہ یہ منحوس زبان بھی برداشت کرنا پڑتی ہے۔“

پھر لڑکیوں کی طرف اشارہ ہوا۔ ان میں سے ایک نے رباب بجانا شروع کیا۔ دوسری نے کنجہ سنبھال لیا اور اس نے انتہائی دلگیر اور پاکیزہ لہجہ میں نغمہ چھیڑ دیا۔

کبھی میری آنکھوں کی آب نے عدن کی موتیوں کو آبرو عطا کی تھی

لیکن اب تقدیر نالے پڑھتے پڑھتے کم نور ہو گئی ہیں

اس لئے کہ میں غلام ہوں

میرے سیاہ بالوں کے جالوں میں گزرے زمانوں کے تمام ناکام عاشقوں اور آنے والی صدیوں کے تمام نامراد معشوقوں کے مقدر کی سپاہی تڑپ رہی ہے۔ اس لئے کہ میں غلام ہوں۔ میں۔۔۔ کہ اگر پتھر پہن لوں تو ہیروں کی طرح جنگا انھیں۔۔۔ اگر صوف پہن لوں تو زریفت کی طرح جگ جگ مگ کرنے لگے۔ لیکن آہ۔۔۔ مجھے اونٹ کی میٹگنیوں اور گھوڑے کے چاکوں سے کہاں فرصت۔۔۔ اس لئے کہ میں مسلمان ہوں۔ میرے جسم کا سونا، ناخن کے لعل، ہونٹوں کا یا قوت، دانتوں کے گوہر، آنکھوں کا نلیم اور ہیرا اگر بغداد اور قاہرہ کے خلیفہ دیکھ لیں تو قیامت تک ان کی تلواریں بے نیام رہیں مگر آہ۔۔۔ میں توسی



اب وہ عسقلان کے راستے پر چل رہا تھا جس کے دونوں طرف سیب، انجیر اور خوبانی کے باغ تھے۔ ایک باغ کے سائے میں چشمے کے کنارے پڑاؤ ڈالے ہوئے آدمیوں کے سوکھے جسم، رد کھے چہرے، خالی نظریں اور پرانی عبائیں چلا کر کہہ رہی تھیں کہ ہم مسلمان ہیں، ہم مسلمان ہیں۔ اس کے گدھے سے اترتے ہی ان مجبوروں نے اپنا آرام تہہ کیا اور کھڑے ہو گئے، سینوں پر صلیب بنائی اور سارا باغ اس ایک تنفس کے لئے چھوڑ کر تنگی زمین اور چمکیلی دھوپ میں بکھر گئے اور وہ اپنے گدھے کے پاس چشمے کے کنارے بیٹھے ہوا میٹھی کھجوریں چباتا رہا اور نمکین آنسو پیتا رہا۔

وہ عسقلان کے اس محلے سے گزر رہا تھا جس کے مکان بوسیدہ، دیواریں شکستہ، دروازے میلے اور دن کے وقت بند تھے اور گلیاں سنسان اور گندی تھیں جیسے یہاں کوئی دبا زیرے ڈالے پڑی ہو۔ پھر ایک لمبی چوڑی میلی کچی عمارت کے کھلے ہوئے دروازے کی پیشانی پر نگاہ پڑی۔

”مدرسہ علوم اسلامیہ“

اس نے اپنے گدھے کی لگام دبیز کی کنڈی سے باندھی اور اندر چلا گیا۔ غلام گردش میں کھڑے ہو کر اپنے چہرے کا پسینہ خشک کیا اور پانی کے لئے ادھر ادھر دیکھ کر اس کشادہ کمرے میں داخل ہو گیا جس سے زندگی کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ ان گنت ستون اس وسیع کمرے کی اونچی چھت کو سنبھالے ہوئے تھے۔ چاروں طرف کی اندرونی محرابوں پر قرآن مجید کی آیتوں کے کتبے دھندلا گئے تھے۔ چھت کا روغن اڑ گیا تھا۔ فرش کے میلے میلے نقش و نگار پر کہیں کہیں پرانی چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ان پر بوڑھے، جوان اور بچے دوڑاؤ بیٹھے ہوئے فرانسیسی زبان کی کتابیں پڑھ رہے تھے، تختیاں لکھ رہے تھے۔ سانسے اونچی سی کرسی پر ایک پادری بیٹھا بازو میں کھڑے ایک لڑکے کی تختی دیکھ رہا تھا جیسے ظالم عدالت مجرم کی فرد جرم ملاحظہ کر رہی ہو۔ کرسی کے پیچھے ایک جلا دھما سپاہی اونٹ کے بالوں کا کوڑا لئے سانسے بیٹھے ہوئے آدمیوں کو گھور رہا تھا جیسے تھائی جانوروں کے گلے میں کھڑا ہوا راس ٹول رہا ہو۔ اس نے پادری کی نگاہ اٹھتے ہی رسمی گفتگو کی اور اسے کرسی پر بٹھا کر باہر

کاڈھیلا ہوں جس سے سورا پنی نجاست پاک کرتے ہیں..... اس لئے کہ میں غلام ہوں۔
میں کہ اگر شہنشاہوں کے حضور میں لا پرواہی سے ایک پیمانہ ڈھال کر رکھ دوں تو سات پشتوں کی تربیت کی ہوئی شہزادیاں مجھ سے تہذیب سیکھنے کے لئے میری جوتیوں کو سلام کریں۔

لیکن میں تو گدھوں کے چرانے والوں کے ساتھ سونے پر مجبور ہوں
اس لئے کہ میں غلام ہوں

میں اس قوم کی بیٹی ہوں
جس قوم کے بیٹوں کے ہاتھ کھوار اور پاؤں رکاب کا مزہ بھول گئے
نہیں تو ہندوستان سے مصر تک اور سرقند سے افریقہ تک کسی نہ کسی نے تو میری فریاد سنی ہوگی

مگر آہ میرے بھائی تو غلام ہیں

جنھوں نے اپنے باپ ”مذہب“ کا سرتار لیا

اپنی ماں ”زبان“ کے پیٹ میں چھرا بھونک دیا

جس نے انھیں جنم دیا تھا

ہائے میرے بھائی تو غلام ہیں مگر

میں کیوں روؤں؟

مجھ جیسی ہزاروں بہنیں مجھ سے بدتر جانوروں کی زندگی گزار رہی ہیں

میرے ہاتھ تو ہیں، پاؤں تو ہیں، آنکھیں تو ہیں، زبان تو ہے

باوجود اس کے کہ میں غلام ہوں

ہائے میں غلام ہوں۔

بد نصیب مغنیہ چلی گئی۔ محفل اجڑ گئی۔ وہ اٹھ کر چلا آیا۔ گر جا کے حجرے میں لیٹ

بھی رہا لیکن گیت کے الفاظ ان کی سماعت پر ہتھوڑے چلاتے رہے۔ اس کے کان بجتے

لگے۔ ایک ایک ہڈی بجنے لگی اور صبح تک کر دھیس بدلتا رہا۔ اس مظلوم مطربہ کے بھائیوں کو

کھوار اور کلب کی لذت یاد دلانے کا منصوبہ بناتا رہا۔

تہقیم لگا رہے تھے۔ پھر ایک چبوترے پر آفتاب اتر آیا۔ ایک کسن لڑکی مہین حریر کی چادر پر ستر پوشی کی تہمت لگائے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں پیروں کے نیچوں پر گڑی ہوئی تھیں اور سفید چہرہ متمتا کر سرخ ہو گیا تھا اور آنکھوں میں خشک آنسوؤں کے زخم تھے۔ کمر میں بندھی ہوئی رسی ایک دلال کے ہاتھ میں تھی اور وہ نگلی آواز میں چلا رہا تھا۔

”صاحبان ہارون الرشید کے بغداد کا سورج ہے۔“

”صاحبان!“

”عبدالملک کے دمشق کا چاند ہے۔“

”صاحبان۔ یہ وہ چیز ہے جس پر سوسور بانوں کی تلواریں پہرہ دیا کرتی تھیں۔“

”صاحبان۔ یہ قاہرہ کے امیر المؤمنین کا لخت جگر ہے۔“

”اور صاحبان اس کے دام ہیں پانچ دینار..... پانچ دینار“

”پانچ دینار میں ایک حر۔ صاحبان صرف پانچ دینا۔“

”پانچ دینار میں سمور کی ایک قبائلی ہے جو دو برس میں بیکار ہو جاتی ہے۔“

”صاحبان پانچ دینار میں یہ ریشمی قبائلیجے اور ہارون الرشید کی طرح میں برس

عیش کیجئے۔ نہیں ساری عمر عیش کیجئے۔“

ایک ادھیڑ عیسائی نے اپنے گندے پیلے دانت نکوس کر اسے دیکھا اور قبا کی بیٹی میں جھولتے ہوئے سے پانچ دینار نکال کر دلال کی ہتھیلی پر ڈال دیئے اور اس کی کمر پکڑ کر اپنے کندھے پر لاد لیا جیسے مزدور آٹے کی بوری لادتا ہے۔ اس کی بھوک اڑ گئی اور پیروں میں پرلگ گئے۔ دوڑتا ہوا آیا اور گر جے کے دالان میں پٹھی ہوئی سنگ سرخ کی تپائی پر ڈھیر ہو گیا۔ پھر گر جے کا خادم آیا۔ ادب سے سلام کر کے بازو میں بنے ہوئے مہمان خانے کے ایک کمرے میں ٹھہرا دیا جس میں ایک آراستہ پلنگ، دو کرسیاں، ایک تپائی، ایک شمع دان، ایک عود دان، ایک آنکٹھی اور ایک بائیل موجود تھی۔ وہ کٹے ہوئے کھجوروں کی طرح اس پر پڑا رہا۔

اتوار کی صبح تھی اور وہ گر جا کے سانسے سبزے پر ٹہل رہا تھا اور پھولوں کی جھاڑیوں کے سرمئی گیلے دیکھ رہا تھا کہ دروازے پر ایک آدمی آیا اور سڑک پر ادھر ادھر دیکھ کر شانے

نکل آیا۔ وہ محراب ہی میں تھا کہ جیسے اس کی پیٹھ پر کوڑے برسے لگے۔ بھیڑیوں کو شکار مل چکا تھا۔ قبروں کی طرح پھیلے ہوئے چھوٹے چھوٹے مکانوں کے قبرستان سے نکل کر وہ عسقلان کے دوسرے محلوں میں آ گیا جہاں سفید اور بھورے پتھر کے صاف ستھرے بلند و بالا مکانات تھے جن میں بچی کاری کے گرانڈیل خوبصورت دروازے لگے ہوئے تھے جن پر سبک نقشے اور سڈول ہاتھ پیروں اور گندی رنگ کے مسلمان غلاموں کا ہجوم تھا۔ راستوں پر مسلمان جھاڑوے رہے تھے، مشکین لادے پانی چھڑک رہے تھے۔ گدھوں کی لگا میں اور گھوڑوں کی رکاب میں تھامے ملے جلنے والوں کو دیکھ کر سینے پر صلیب بناتے گزر رہے تھے۔ بازار میں مسلمان حالوں کا انبوہ کھجور کے پتوں کے نوکروں میں بیٹھا ہوا مزدوری دینے والی آسانی آوازوں کا انتظار کر رہا تھا۔ پھول سی عورتیں پیروں کی سی عبا میں پہنے گھاس اور ایندھن کی ڈھیریوں سے سوکھے پھلوں کی نوکریوں کے پیچھے بیٹھی ہوئی کالی آنکھوں سے گاہکوں کی بھیک مانگ رہی تھیں۔ سونے چاندی کی دوکان کے پاس ایک مسلمان جوان آدمی گدھے کی لگام تھامے کھڑا تھا جس پر ایک عورت سیاہ سوئی گفتان پہنے آدھے چہرے پر نقاب ڈالے بیٹھی تھی اور اسے دو تین نو جوان عیسائی اپنے گھیرے میں لیے نوج کھسٹ رہے تھے اور تہقیم لگا رہے تھے۔ سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک آدمی سے کہا کہ میں اپنا گدھا بیچنا چاہتا ہوں۔ اس نے ایک گلی میں چھوڑ کر گدھا ہانک دیا جو ان گت آدمیوں سے بچتا ہی نہیں اور ان کے پسینے اور گدھوں کی لید سے بھگ رہی تھی۔ اس نے جیسے تیسے اپنے گدھے کے چار دینار (سفید) کھرے کئے اور اگلے بازار کے کشادہ کوچے میں آ گیا۔ اب اسے بھوک لگی اور ایک آدمی سے پتہ پوچھ کر دوسری گلی میں گھس گیا۔ گلی کے موڑ پر لمبا چوڑا میدان تھا۔ اس کے چاروں طرف دالان در دالان حجرے اور کمرے تھے جن کے پتھر مختلف رنگوں سے رنگے ہوئے تھے اور جو ریشمی قباؤں، چمکیلی چادروں، قیمتی تھپیاردوں اور چمڑے کے موزوں سے آراستہ، تندرست اور خوبصورت انسانوں سے بھرے ہوئے تھے۔ میدان میں چھوٹے بڑے سنگین چبوترے بنے ہوئے تھے جن پر قندکار نمکیرے لگے تھے، کرسیاں پٹھیں اور تختوں پر قالینوں کا فرش تھا۔ ان پر عیسائیوں کے گردہ نارنگلی سے شغل کر رہے تھے، جام لٹدھا رہے تھے اور رانیں کھجا کھجا کر

پر جھوٹے کپڑے کے تھیلے سے کچھ کاغذات نکال کر بکھیر دیئے۔ وہ ٹہکتا ہوا اڑتے اوراق کی طرف چلا کہ پشت سے آواز آئی۔

”ناشتہ حاضر ہے۔“

گر بے کا خادم ناشتے کی کشتی لئے کھڑا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں چلا آیا اور ناشتہ کرنے لگا۔ ابھی وہ کمرے ہی میں تھا کہ گر جا کے درد آوازے پر تند و تیز آوازیں اچھلتے لگیں اور جب تک وہ باہر آئے چھوٹی موٹی بھیڑ جمع ہو گئی۔ گر بے کے خادم آرائش و زیبائش کو ادھورا چھوڑ کر نکل آئے۔ ایک نو جوان راہب پیچ پیچ کر کہہ رہا تھا۔

”کسی مسلمان نے ہماری بائبل کو پھاڑ کر جوتوں سے سل دیا ہے۔“

”میں گر بے کے سامنے مقدس دین کی بے حرمتی کی گئی ہے۔“

دوسری آواز۔

”سارے شہر کے مسلمانوں کی ایک منظم سازش ہے۔“

کسی منچلے نے ٹکڑا دیا۔

”تو پھر ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر پھینک کیوں نہیں دیتے؟“

پھر بھیڑ جمع بن گئی اور مجمع جلوس کی شکل اختیار کر گیا اور جلوس لشکر کی طرح نعروں کے جھنڈے اڑاتا شہر کے اس حصے میں داخل ہو گیا جہاں میں ہزار مسلمان جانوروں کی زندگی گزار رہے تھے۔ ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں قربانی کے بکروں کی طرح اپنی جان کی خیر منار ہے تھے، اپنی بے نام آبرو کی حفاظت کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ پھر بکتر پوش سواروں نے نیزوں میں مشعلیں باندھیں اور مکانات پھٹکنے لگے جس طرح جھٹے سے مکھیاں نکلتی ہیں بوڑھے، جوان، بچے اور عورتیں نکلتے لگیں۔ ان کے ہاتھ خالی تھے اور پیروں میں خوف کی زنجیریں پڑی تھیں۔ پھر ان پر بہادر شہسواروں اور نائی گرامی نائٹوں کی بیاسی کھواریں برستے لگیں اور دم کے دم میں جامع عقلمدان تک تمام کوچے اس خون سے جو پانی سے بھی سستا ہے غسل کرنے لگے۔ ان کی بکریاں، بھیڑیں، گدھے، کھجور کی جیوں کے پٹارے، لکڑی کے چھوٹے بھدے صندوق، میاں بے بد بودار بستر، جھنگھا، چار پائیاں، لکڑی کے سادے پیالے اور مٹی کے برتن چلتے رہے اور جامع مسجد گھیر لی گئی۔ سواروں نے اپنے گھوڑے مسجد

میں دھکیل دیئے اور دس بارہ ہزار مظلوم بے گناہ انسان اپنے خدا کو، رسول کو اور علی کو اور بغداد کے خلیفہ کو اور قاہرہ کے امیر المومنین کو آوازیں دے دے کر روتے رہے اور جھٹے میں بند بھڑوں کی طرح عیسائی سوراخوں اور بہادروں کی کھواروں اور نیزوں کی آگ سے جل جل کر مرتے رہے۔ سیکڑوں جوان اور حسین لڑکیاں اور تندرست اور خوش رو لڑکے بچا کر ہانک لائے گئے اور گر جا کے میدان میں کھڑا کر کے خون میں ڈوبی کھواروں اور نیزوں کو ان عظیم الشان خدمات اور بے نظیر شجاعت کے صلے میں بطور انعام عطا کر دیئے گئے۔ اس مقدس فرض سے سبکدوش ہو کر لوگ ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہوئے عبادت گاہ میں داخل ہوئے۔ پاک مریم کی شبیہ کے نیچے زریں شمع دانوں میں شمعیں جلا کر گر جا کے بڑے پادری نے ارشاد کیا۔

”ہم دین مسیح کے بچے خادم خوں ریزی کو پسند نہیں کرتے اور صلح و آشتی پر ایمان رکھتے ہیں لیکن ہم کو یاد رکھنا چاہئے کہ یروشلیم کی مسیحی سلطنت کی آدھی آبادی اب بھی مسلمان ہے اور یہ وہ مسلمان ہیں جن کے اجداد نے یہاں صدیوں تک حکومت کی ہے اور ان کی حکومتیں آج بھی ہندوستان سے افریقہ تک اور یمن سے سمرقند تک قائم ہیں۔ اگر ان کے ذہن سے ان کے شاندار ماضی کو فراموش نہ کیا گیا اور انہیں تلواریں نیک کر کھڑے ہو جانے کا موقع دیا گیا تو یاد رکھو کہ پڑوسی مسلمان حکومتوں کی مدد پا کر یہ تمہیں بحیرہ روم میں غرق کر دیں گے۔ اس لئے ہماری ہدایت ہے کہ ایشیا کی اس مسیحی سلطنت کو اپنی مسلمان آبادی نابود کر دینی چاہئے۔ سلطنت سے خارج کر دینا چاہئے۔ بچی کبھی آبادی کو اپنی حقیر خدمت کے لئے قبول کر کے ان کی خود اعتمادی کو اس حد تک کچل دینا چاہئے کہ وہ اپنے مسلمان ہونے پر شرمندہ ہو جائیں، عاجز ہو جائیں اور ترک مذہب پر آمادہ ہو جائیں۔ آج جو کچھ ہوا ہے وہ اصولی طور پر بڑا ہوتے ہوئے بھی مبارک ہے۔ اپنے دور رس نتائج کے اعتبار سے بہتر ہے۔ یہ بار بار ہونا چاہئے۔“

نہ صرف مسیحی سلطنت کے اندر بلکہ مسلمان حکومتوں کی سرحدی آبادیوں پر بھی اس کی نگرار ہونا چاہئے۔ طرابلس کے ریمینڈ اور کرک کے رتھینا لڈ نے بھی خدمات انجام دی ہیں جنہوں نے ان کو نہ صرف ہماری بلکہ یورپ کی نگاہ میں افتخار اور امتیاز عطا کیا ہے۔“

شام کو کئی ہزار کا قافلہ جن میں بوڑھے آدمیوں اور ادھیز عورتوں کی کثرت تھی اپنے مفتولوں کو توپ کر گھر دندوں کو جلتا ہوا چھوڑ کر دو تار دھوتا، بھوکا پیاسا عسقلان سے نکل گیا۔ تھوڑے دن بعد قاہرہ کے فاطمی خلیفہ کا سفیر عسقلان کے گورنر سے مذہبی فسادات پر گفتگو کرنے آیا۔ وہ شام کو سفیر کی زیارت کرنے گیا جو دوائی عسقلان کے سرخ محل کے ”روکار“ (سانے) کی عمارتوں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کے گھوڑے سبز زریں مخمل کے زین اور چاندی کے زیور پہنے ہوئے تھے۔ پانچ سو سپاہیوں کے علاوہ جو طلسم کی عباؤں، زر رفت کی چکریوں اور مرصع ہتھیاروں سے سجے ہوئے تھے، پانچ سو کینز بھی تھیں جن کے کپڑوں اور زیب و زینت کے سامان کے لئے ایک ہزار چکر ساتھ تھے۔ سارا عسقلان اس بارات کے جلوس کو دیکھنے کے لئے نکل آیا۔ سلطنت یرد شلم کے اس معمولی گورنر نے امیر المؤمنین کے اس سفیر کو جوان کا بھانجا بھی تھا تین دن تک ملاقات کا شرف نہ بخشا۔ آخر چوتھے دن صبح جب سورج ایک نیزہ چڑھ چکا تھا، محفل منعقد ہوئی جس میں اراکین حکومت کے علاوہ عسقلان کے پادری بھی شریک کئے گئے۔ سفیر کبیر راستے میں خریدی ہوئی نئی کینزوں کے اجلے پنڈے کی گلابی خوشبو میں غرق بیٹھا تھا۔ جب اس نے اپنے خنجر کے مرصع قبضے پر انگوٹھوں سے جڑا ہوا نازک گلابی ہاتھ رکھ کر اور نزاکت و نفاست سے ترشے ہوئے بالوں اور مونچھوں اور داڑھی کے پس منظر میں دکتی ہوئی پیشانی پر حریری شکنیں ڈال کر گفتگو شروع کی تو دوائی عسقلان نے گئے چنے متول یا فارغ الہال مسلمانوں کا وفد اس کے سامنے پیش کیا۔ وفد کے سربراہ نے گلے میں جمائل قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر اعلان حق کیا۔

”ہم کوسیحی سلطنت میں وہی حقوق حاصل ہیں جو بغداد میں فاطمیوں کو اور قاہرہ میں عباسیوں کو نصیب ہیں۔ ہماری عبادت گاہیں محفوظ ہیں۔ ہماری زبان اور ہمارا تمدن زندہ ہے۔ ہم اپنی مسجدوں میں نماز

پڑھتے ہیں اور گھروں میں روزے رکھتے ہیں اور بازاروں اور سیرگاہوں میں مساویانہ انداز میں ٹہلتے ہیں۔ اس فساد کا سبب خود مسلمان ہیں۔ چونکہ مسلمان ماضی میں کامل حاکم رہے ہیں اس لئے آج بھی ان میں ایسے نوجوانوں کی کثرت ہے جو کام سے جی چراتے ہیں اور جب کام نہیں ہوتا تو شیطان کا جادو ازاں ہو جاتا ہے۔ جس دن یہ چھوٹا سارا قلعہ ہوا اس کی شب میں ایک مسلمان نے ایک پادری کی کنواری اور کسن بیٹی کا اغوا کر لیا۔ جب وہ برآمد ہو گئی تو اس نے پادری کے گھر میں گھس کر اس کو زد و کوب کیا۔ یہی نہیں بلکہ اس کی صبح کو اس وقت جب کہ میں نماز پڑھنے جا رہا تھا وہ گر جا پڑھ آیا اور بائیل کو پھاڑ کر بے گناہ عیسائیوں پر تلوار کھینچ کر حملہ آور ہوا اور کئی کوسوت کے گھاٹ اتار دیا۔ نتیجے میں کچھ بچقلش ہو گئی جن کے متعلق آپ کو، ایک بیردنی حکومت کے سفیر کو پوچھ گچھ کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ ہم اسے اپنی حکومت کے داخلی معاملات میں دست اندازی تصور کرتے ہیں اور احتجاج کرتے ہیں۔“

سفیر جو کینزوں کے جگر میں عذاب بھوگ رہا تھا اس مدلل تقریر سے لا جواب ہو گیا اور کسن اور خوبصورت غلاموں کے طلسمیں کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھا اور بغیر کچھ کہے ہوئے چلا گیا۔ سفیر کبیر کی رخصت کے بعد گورنر کے حاشیہ نشین اور پادری بھی اٹھ کر چلے گئے لیکن وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر وفد کا سربراہ بھکاری کی طرح چہرہ لٹکا کر اور ہاتھ سینے پر باندھ کر گورنر کی کرسی کے پانداز کے پاس گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا اور گڑ گڑایا۔

”سرکار عالی نے غلام زادے پر توجہ نہیں کی۔“

”کیا؟ مجھے یاد نہیں آ رہا ہے۔“

”وہ آپ کے غلام کا بڑا بیٹا جو مسلمانوں سے ٹیکس وصول کرنے کی نظامت میں منشی ہے اس کے متعلق حضور عالی کے معتد کو بہکا کر یقین دلایا گیا ہے کہ وہ عربی آشنا ہے۔ قرآن مجید کی قسم وہ عربی کے حروف و آوازیں بھی ناواقف ہے اور خواب میں بھی کوئی زبان بول

ہے تو فرانسسی بولتا ہے۔ میرے ایسے نصیب کہاں ورنہ اگر حضور عالی غریب خانے پر قدم رنج فرمائیں تو روشن ہو جائے کہ میری لڑکیاں تک فرانسسی میں گفتگو کرتی ہیں۔ لنگو نیکا تک سے ناواقف ہیں۔ اگر کبھی سعادت ملی تو درود ملت پر حاضر کر کے سرکار عالی کے گوش گزار کروں گا۔ بڑے پادری صاحب قبلہ نے بڑی توجہ سے انھیں تعلیم دی ہے۔“

یہ کہتے کہتے اس کی باجھیں مصنوعی سرت سے کانوں تک جڑ گئیں اور انداز سے ایسا معلوم ہوا کہ اب گورنر کے قدموں پر سر رکھ دے گا۔

”اچھا میں معتد کو ہدایت کر کے تمہارے بیٹے کو بحال کرادوں گا۔“

وہ پیشہ درگد اگر اس کی طرح گورنر کی گزشتہ اور آنے والی تین تین نسلوں کو عمرو اقبال کی دعائیں دینے لگا۔ گورنر اس کی کجی صورت اور گھناؤنی خوشامد سے اکتا کر اس سے مخاطب ہوا۔

”آپ ہمارے مہمان اور دوست جون ہیں جو دمشق سے آرہے ہیں اور بیت المقدس کی زیارت کو جا رہے ہیں اور آپ یہاں کے سب سے معزز خاندان کے چشم و چراغ ہیں اور عسقلان کی مسلمان آبادی کے ہادی عبادہ بن عباس ہیں۔“

”تو آپ دمشق سے آرہے ہیں..... بڑی خوشی ہوئی جناب عالی..... فرمائیے وہاں کے مسلمانوں پر کیا گزر رہی ہے۔ میں نے سنا تھا کہ نور الدین محمود زنگی نے وہاں قتل و خون کا بازار گرم کر رکھا ہے اور مسلمان بھاگ بھاگ کر دوسری حکومتوں میں پناہ لے رہے ہیں۔“

”یہ اطلاع تو مجھے یہاں پہنچ کر مل رہی ہے۔“

”ممکن ہے کہ جناب عالی کو مسلمانوں کے افکار و اعمال سے زیادہ دلچسپی نہ ہو..... اچھا حضور والا ایک گزارش ہے۔“

”فرمائیے۔“

”آپ شام کو میرے ساتھ تشریف لے چلے۔ عسقلان کی سیر کیجئے اور جو دال دلیا نصیب ہو متا دل فرمائیے۔“

اس نے گورنر کی طرف دیکھا اور گورنر نے ”ضرور ضرور“ کہہ کر اپنی جان بچائی اور اس کے سینے پر ہنسی ہوئی صلیب کی طرف نگاہ کئے بغیر اٹھ گیا۔

شام سے قبل ہی وہ ایک گھوڑے پر سوار دوسرے کو تل گھوڑے کی لگام تھامے وارد ہوا اور اسے سوار کرا کے شہر کی طرف چل دیا۔ معمولی معمولی عیسائیوں کو سلام کرنے میں کبھی وہ گھوڑے کی گردن پر پیشانی رکھ دیتا اور کبھی داہنی بائیں رکابوں تک جھک جاتا۔ وہ اس کے ان کرتبوں کو دیکھتا ہوا اور چلتا ہوا۔ جب وہ گھر پہنچا تو غلاموں نے جن کے چہروں پر مجبوری اور مظلومی کے سائے تھے انھیں گھوڑوں سے اتارا اور پتھر کا منقش دروازہ کھول دیا۔ سبزے کے کنارے گرجے کے باغ کا ایک ایک مغربی پھول اور پودا اپنی اسی شکل اور صورت میں کھڑا تھا۔ مکعب کمرے کے بھورے پتھر کی دیواریں سفید رنگی ہوئی تھیں۔ فرش پر سیاہ قالین بچھا ہوا تھا۔ چاندی کے چراغ دانوں اور آبنوس کی دیوار گیر یوں پر پاک ماں مریم اور خدا کے بیٹے کی تصویریں کھدی ہوئی تھیں اور دیواروں پر بھدے رنگوں میں بائبل کے افسانے منقش تھے۔ پھر دروازے پر پڑا ہوا مغرب کے منظر سے آراستہ پردہ ہٹا کر نصرانی دوشیزاؤں کا لباس پہنے ایک لڑکی آئی اور سینے پر صلیب بنا کر اس طرح گھوم گئی کہ کمر کے اوپر کے تمام نشیب و فراز بول اٹھے۔ عبادہ اس لسان جوہری کی طرح جو اپنے معمولی موتیوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے چمک اٹھا۔

”یہ میری بڑی بیٹی ہے حضور والا۔“

اور بیٹی گاڑھی فرانسسی میں گویا ہوئی جس کی شد بد سے وہ بھی آشنا تھا۔

”میرا نام ایمنہ ہے۔“

”ایمنہ؟ اچھا، ایمنہ ہے۔ خوب خوب۔“

اس نے فصیح عربی کے کسالی لہجے میں لقمہ دیا۔ اتنی دیر میں دوسری بیٹی تشریف لاپچی تھیں اور بڑی بہن کی پڑجوش تھلپ کر چکی تھیں۔

”میرا نام ایڈریسہ ہے۔“

”یعنی ادیسہ ہے۔“

اس نے چنگی لی اور وہ دونوں بیٹیاں اپنے باپ کو اس طرح دیکھنے لگیں گویا اس نے ان کی بھیا تک تذلیل کے لئے سازش کی ہو اور عبادہ نے سمندر پار کے پادریوں کے لہجے میں ارشاد کیا۔

”مہذب انسان ہونا بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔“

ایک بیٹی نے جل کرتے لہجے میں سوال کیا۔

”کیا مقدس باپ بالکل فراموشی نہیں جانتے؟“

”ہاں اسی طرح جس طرح فرانسیسی عربی سے نا بلند ہیں۔ میں دمشق میں پیدا ہوا

ہوں اور دنیا کی سب سے مہذب اور دولت مند زبان کو مادری زبان کہنے کا شرف رکھتا ہوں۔“

پھر محفل بڑی خشکی کے ساتھ کھانے کا انتظار کرنے لگی۔ اسے دوسرے کمرے

میں لے جایا گیا جہاں آتش دان کے سامنے ایک بد صورت میز پر ایلے ہوئے گوشت اور

پھیکے شوربے کی اقسام چنی ہوئی تھیں اور پانی کے بجائے شراب چھلک رہی تھیں۔ وہ تازہ

پھل ٹونگتا رہا۔ جب اصرار کی شدت بڑھ گئی تو اس نے کہا۔

”میں مغرب کے بے مزہ اور پھیکے کھانے قطعی ناپسند کرتا ہوں اور ان کی بدبو کا

متمل نہیں ہو سکتا۔ براہ کرم اس آتش دان کی آگ بجھا کر ٹھنڈا پانی منگواد دیجئے۔“



عسقلان پر لنگر انداز یہ دشمن کے جنگی بیڑے کی قوت کا اندازہ کرتا ہوا وہ ساحل

ساحل بیت المقدس کی طرف بڑھا۔ خچر کی بیٹھ پر بیٹھے بیٹھے اس کی کمر لوٹ گئی اور پنڈلیاں

نیرھی ہو گئی تھیں لیکن وہ اپنے عزم پر ثابت قدم رہا۔ بیت المقدس کی شہر پناہ کی سرخ دیوار

نے جب اس کی نگاہ پر چلوں کیا تو فجر سے پھانڈ پڑا اور نظر آتے ہوئے حضرت ابو خیر انصاری

کے گنبد کی طرف چل پڑا۔ مزار کے کبوتروں اور بایلوں نے پر پھینکا کر اس کی پیشوائی کی

اور وہ ان کی بیٹ کے فرش پر دوڑا نو بیٹھ گیا اور تنہائی کو غنیمت جانب کر نماز ادا کی اور باؤلی

میں نہاد ہو کر مسجد اقصیٰ کی زیارت کے لئے اٹھا اور مقام قدس کی قربت کے نشے میں سرشار

جھومتا ہوا چلا۔ بڑی دیر تک وہ بھٹکتا رہا لیکن اس مسجد کا راستہ نہ ملا جس کے عظیم الشان گنبد

پر ٹونا ہوا ہلال، شکست خوردہ قوم کا نشان ٹوٹے ہوئے خنجر کی طرح چمک رہا تھا۔ ہر طرف

ٹمپلر اور ہاسٹلرز کے سواروں اور ناسٹوں کے مکانات راستہ روکے کھڑے تھے اور راستہ

سفید داڑھیوں، بھاری صلیبوں اور نیچی عباؤں سے لبریز تھا۔ آخر اس نے ایک مسلمان

غلام سے مسجد حضرت عمر کا پتہ پوچھا۔ اس نے حیرت سے دیکھا اور اس کے آگے آگے چلے

لگا۔ پھر وہ ایک محراب سے اندر داخل ہوا جس کے دالانوں میں عامیوں کے حمام تھے اور

صحن میں گھوڑے بندھے تھے۔ محراب کے کڑوں میں گندی عباسی جھول رہی تھیں۔

دیواروں پر دھوئیں کی دھاریوں کے سانپ لپٹے ہوئے تھے، فرش پر غلیظ برتن بھٹک رہے

تھے۔ وہ ان ہیبت ناک نظاروں سے کانپتا ہوا اس مصلے پر جا کھڑا ہوا جسے حضرت عمر کے نام

سے نسبت تھی۔ دھوپ کی آڑی گلابی کرنوں میں اندرونی عمارت کی چھت اور اس کی

دیواریں اور سطعے اور ستون اور ان کے پرکالے اور قرآن مجید کی آیتوں کے سونے کے

حروف جھلک رہے تھے جیسے ایک ایک پتھر کی ٹکلی اور مرصع سطح پر آن گت رنگوں کی شمعیں جل

رہی ہوں۔ وہ کھڑا رہا، کانپتا رہا، روتا رہا۔ پھر قبلہ رو ہو کر دوڑا نو بیٹھ گیا اور تلاوت کرتا رہا۔

جب ہوش آیا تو بیرونی دالانوں میں روشنیاں لرزنے لگی تھیں اور بے ادب آوازوں کا بازار

لگ گیا تھا اور گھوڑے پاؤں شیخ شیخ کر منہ پر چڑھے تو بڑے ہلا ہلا کر دانہ کھا رہے تھے۔ وہ

غیظ و غضب کے عالم میں اٹھا اور اس مقدس پتھر کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا جس کا نام ”صحرا“

ہے اور جس پر حضرت ابراہیم، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان نے قربانیاں کی تھیں اور

جہاں سے حضرت رسالت مآب کو معراج ہوئی تھی، وہیں اس نے آنسوؤں کی زبان سے قسم

کھائی کہ جب تک دین کے اس سنگین صحیفہ کو اپنی تلوار سے پاک نہ کر دوں گا کوئی راحت

قبول نہ کروں گا۔

وہ کئی دن وہاں پڑا رہا۔ فصیل کے دروازوں، درمیںوں، برجوں اور سورجوں کی

مضبوطی اور خندقوں کی گہرائی دیکھتا رہا۔ سپاہ کے ولولے اور سرداروں کے حوصلے پڑھتا رہا

اور دیواروں کے رخنے اور دلوں کے اندیشے ٹوٹتا رہا۔



اب مصر سامنے تھا۔ وہ مصر جس کے بادشاہ فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا اور

جس کے سینے پر تلوار ٹیک کر اس نے بیت المقدس کی فتح کا منصوبہ بنایا تھا۔ جب نور الدین

زنگی کے سپہ سالار اور اس کے چچا اسد الدین شیر کوہ نے سفر آخرت اختیار کیا اس وقت اس کی

عمر ملک شاہ سلجوقی کے آئین حکومت کی ایک دفعہ کے مطابق چھتیس برس پورے کر چکی تھی

اور اس کے سر پر فاطمی خلافت کی وزارت عظمیٰ کی دستار حکومت باندھی جا چکی تھی اور جب

اس نے خلیفہ کے سوڈانی سواروں کے امیر نجات کے سازشی ہاتھ توڑ دیئے تب کم عمر امیر المومنین کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا جس کی عیاشیوں اور دربار کی سازشوں نے عیاشیوں کو جرات دلائی تھی کہ وہ مقامات مقدسہ کو تاراج کر ڈالنے کا بھیانک خراب دیکھیں۔ وہ ممالک محروسہ کے امیروں کے نام فرامین لکھوا رہا تھا کہ طیب خلافت باریاب ہو۔ وہ ہزحریری عبا پر سبز چادر ڈالے، سبز عمامہ باندھے زمرہ کی تسبیح لئے اندر آئے۔ مسند کے کونے پر تسبیح روکی اور گزارش کی۔

”میں وزارت عظمیٰ کے حضور میں ایک ضرورت سے حاضر ہوا ہوں۔“

”میں ارشاد کی تعمیل کی سعادت حاصل کروں گا۔“

”آپ کو علم ہوگا کہ ایک عرصے سے امیر المومنین کی صحت خراب ہے۔“

”دوسرے ذرائع سے میں نے معلوم کیا ہے۔“

”آپ کو درست بتلایا گیا ہے..... ان کا جگر خراب ہو چکا ہے..... نہیں جہاں ہو چکا ہے.....“

نہض کی قوت میں فرق آچکا ہے..... لیکن نہ شراب چھوٹی ہے اور نہ عورتوں سے

رغبت میں کمی آئی ہے۔ آپ کا وہ طائفہ فرماتے ہیں، آپ انہیں سمجھائیں۔“

”میں کوشش کروں گا لیکن.....“

”شاید میں معاملہ کو پوری نزاکت اور اہمیت سے بیان نہ کر سکا۔ آج جب میں

نے ان کی نہض دیکھی تو مجھے یقین ہو گیا کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو وہ چند روز سے زیادہ.....“

”کیا آپ کے خیال میں مجھے ابھی باریاب ہونے کی کوشش کرنا چاہئے؟“

”جی ہاں..... ابھی..... اسی وقت۔“

”بہتر ہے۔“

طیب کی رخصت اور ظہر کی نماز کے بعد وزیر اعظم کا وہ چغہ پہنا جس کے نیلے موتیوں کے تھے اور جس کے شمسوں پر جواہرات لٹکے ہوئے تھے۔ وہ عمامہ پہنا جس پر ایک انگل کا بیضوی ہیرا جڑا تھا اور موتیوں کا سر بیچ پڑا تھا، زرد نگار کٹنی لگی تھی، جڑاؤ کمر بند میں وہ تلوار باندھی جو خلیفہ کی کمر میں کئی مہینے رہ چکی تھی اور جس کے نیام کی قیمت دس ہزار دینار ہیر ختم تھی اور اپنے مملوکوں اور ترکمانوں کے جلوس میں منگی گھوڑے پر سوار ہوا جس کا شجرہ

نسب اس شہید سے مل جاتا تھا جس کی پیٹھ سے شہید کر بلا نے یزیدی لشکر پر یلغار کی تھی اور جسے خلیفہ نے بطور خاص عنایت فرمایا تھا۔ امیر المومنین کے خاص محل قصر کبیر کے سامنے میدان میں جسے ”بین القصرین“ کہا جاتا تھا، امیر المومنین کا ذاتی محافظ لشکر کا ایک دستہ نیزے بازی کی مشق کر رہا تھا۔ باب الغرب کے نوبت خانے میں دفن، نے اور ارگن سلامی دینے والی دھن میں بجز رہے تھے۔ وہ اس محل میں داخل ہو گیا جس میں چار ہزار کمرے تھے اور اٹھارہ ہزار انسان قیام کئے ہوئے تھے۔ تین ہزار مہر میں ستونوں کے سامنے زربفت کے لباس اور سونے کے ہتھیار پہنے غلام ہر گھڑی کھڑے رہتے تھے۔ قصر کے اندر باب الحضر ت پر پانچ سو یو پیکر حبشی سرخ حریر کے تہبند پر سونے کی پٹی میں ایک ایک بالشت چوڑے نیلے تینے ڈالے، کندھوں پر خاردار گرز رکھے لال لال دیدے نکالے ایستادہ تھے۔ ان کے سردار نے سلامی دے کر دروازے کا پکڑ کر اسے اتار لیا اور آگے بڑھ کر ٹھوس چاندی کا بھاری دروازہ کھول دیا۔ اب وہ بارہ مملوکوں کی نگہبانوں کی حفاظت میں چل رہا تھا۔ سارا راستہ سفید تھا اور ایک ایک انگل چمکی کاری تھی۔ دونوں طرف مشرق و مغرب کے مشہور پھولوں، پھلوں کے مختلف الصورت بیلوں اور درختوں کو اس طرح سجایا گیا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح جانور کی قامت سے مشابہ تھے۔ ان میں ہاتھی، گھوڑے، اونٹ اور شیر کثیر تعداد میں تھے۔ ان پر انسانی تخیل میں آنے والے ہر رنگ اور ہر صورت کے پرندے چھپا رہے تھے اور ہر قسم کے پھولوں کے تختے لہلہا رہے تھے۔ وہ تیسرے دروازے باب الداخلہ کے اس مشہور کمرے میں ٹھہرا دیا گیا جس میں بڑے بڑے سفید دل اور امیروں کو باریاب ہونے سے قبل ٹھہرنا پڑتا تھا۔ اس کے فرش پر وہ قالین تھے جو سونے اور چاندی کے تاروں سے بنے گئے تھے۔ دیواریں کخواب سے منڈھی ہوئی تھیں اور چھت سونے کی تھی۔ جس پر ہر رنگ کے جواہر سے گل بوٹے بنائے گئے تھے۔ چاندی کے دروازوں پر معجز رقم خطاطوں نے آب زر سے عربی میں اشعار لکھے تھے۔ کمرے کے کونوں میں پورے قد کے چار زریں شیر تھے جن کی پیٹھ پر بیضادی سمیں کشتیوں میں شربت بنیذا اور شراب کے بلوریں قرآن اور آجینے اور نقل کی ہر قسم ہر وقت موجود ہوا کرتی تھیں۔ چھت میں وہ فانوس جھول رہا تھا جس میں ایک سوا ایک شمعیں روشن ہوا کرتی تھیں اور جس کے لعلی شمعوں کی طرح منور تھے اور جو ہر وقت سفید غبر

نوارہ عرق گلاب کی پھواریں اڑا رہا تھا۔ سارے باغ میں مدتوں کی تربیت یافتہ، حسن میں بے نظیر کنیریں صرف کمر پر چھوئے چھوئے موتیوں کی لڑیاں باندھے رقص کے کمالات دکھلا رہی تھیں۔ وہ تخت کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ تین مرتبہ کمر سے تلوار کھولی اور باندھی۔ خلیفہ نے داسے ہاتھ کا اشارہ کیا یعنی سلام قبول کر چکا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ باغ کی عورتیں بدستور ناچتی رہیں اور اپنے جسم کی ہوش رہبانائش کرتی رہیں۔ خلیفہ کے چہرے پر بخدر کے آثار نمایاں ہو چلے تھے۔ سوکھا ہوا لمبی چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔ اس نے عرض مدعا کرنا چاہا کہ پشت سے ایک کنیر برآمد ہوئی۔ اس کے سر پر سونے کا طشت تھا جس میں سرخ شراب کا شیشہ اور آگینہ رکھا ہوا تھا۔ دوسری کنیر نے طشت اتار کر اس کو پیش کیا۔ اس نے آگینہ کو سر تک اٹھایا اور طشت پر رکھ دیا۔ سینے پر ہاتھ باندھ کر اور سر کو خم دے کر عرض کیا۔

”میں اس نعمت سے محروم کر دیا گیا ہوں۔“

امیر المومنین حقارت سے ہنس دیئے اور ناپنے والیوں کے ہلکے تھپوں سے سارا دربار لبریز ہو گیا اور وہ سر سے پاؤں تک ندامت سے شرابور ہو گیا۔ امیر المومنین کے ہاتھ کی جنبش پر باجے گنگانے لگے، پھر بجنے لگے اور آفتاب و ماہتاب سے حسین دو کنیریں خوا کا لباس پہنے پاگلوں کی طرح ناپنے لگیں۔ باج کے زوال کے وقت وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور خلیفہ کی طرف دیکھا لیکن اس کی نگاہ ناپنے والیوں کے عریاں کو کھوں پر ٹپکی ہوئی تھیں۔ اس نے تخت کا طواف کرنے کے بجائے اس کے پائے کو بوسہ دیا اور اگلے پیروں باہر نکل آیا۔ قصر وزارت کے میدان میں قدم رکھتے ہی بوڑھے مردوں، عورتوں اور بچوں کا قافلہ نظر آیا جن کے پیروں میں پاپوش کے بجائے گودڑ بندھا ہوا تھا اور بدن پر لباس کی جگہ جھٹھرے لپٹے ہوئے تھے۔ ہاتھوں اور پیروں میں خون سے داغدار میلی پٹیاں بندھی تھیں۔ آنکھیں مردوں کی طرح خالی اور چہرے بھکاریوں کے مانند بے کس تھے۔ ایک چھ سات برس کا بچہ لڑکا اس کے جگمگاتے لباس اور گھوڑے کا ساز و سامان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ عورتوں کے بے نقاب چہرے اس کے وجود سے بے نیاز روٹی کی فکر کی پر چھائیوں سے آباد تھے۔ اس نے گھوڑا روک لیا اور قریب آتے ہوئے بوڑھے کو مخاطب کیا جس کے چہرے سے نجات ٹپک رہی تھی۔

کے دھویں سے مضطرب رہا کرتا تھا۔ اس کی آنکھیں ان لوازمات کو دیکھتی رہیں اور کان ان مظلوموں کی فریاد سنتے رہے جن کے سینے صلیبوں کی تلواریں سے لال تھے۔ پھر مشہور خواجہ سراجیم آیا جس نے فونی ڈاکو جو سلسل اور شاہ یرو غلم بالڈون سے رشتہیں چاہی تھیں اور مصر کے خزانے لوٹے تھے اور خلافت کی حرمت پر چر کے لگائے تھے۔ یہ وہ شخص تھا جس سے مصر کے خلفاء ڈرتے تھے اور جو مہر خلافت کا امین تھا۔ اس کا قد اونچا، رنگ روشن، آنکھیں سبز اور داڑھی مہندی سے لال تھی۔ اس کی آواز میں ولیوں کا جلال اور نگاہ میں شہنشاہوں کی جبروت تھی۔ اس نے آتے ہی دست بوسی کی اور پیشوائی کی صورت بنا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنے سرداروں کو چھوڑ کر اس حرم میں داخل ہوا جس نے صدیوں سے اپنے جلیل المرتبت امراء کے علاوہ کسی مرد کی صورت نہ دیکھی تھی، کسی ہتھیار کو بے خلاف نہ پایا تھا۔ یہاں حرم ٹھہر گیا۔ سنگ مرمر کے قد آدمی چبوترے کے چاروں طرف اونچے اور سبز درختوں کا حلقہ تھا۔ مظاہرین پر بربری کنیریں کمر کے تلواریں علم کئے کھڑی تھیں۔ چبوترے پر ایک طرف چاندی کے ستونوں پر سونے کے تاروں کا شامیانہ اور زمین پر بے نظیر قالینوں کا فرش تھا۔ وسط میں مظاہرین صحن تخت تھا۔ اس کے چاروں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سونے کے ہرن، مرغ، طاؤس اور عقاب اپنے پورے قد میں کھڑے بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھیں ہیرے اور نیلم کی تھیں۔ تخت پر مسند سے لگا نو عمر خلیفہ بیٹھا تھا۔ اس کی داڑھی ہلکی سنہری تھی۔ آنکھوں میں مستی اور چہرے پر زردی تھی۔ سر پر موتیوں کا عمامہ، شانوں پر جواہرات سے مزین طیلساں ڈالے ایک نئے متعہ کا جشن منا رہا تھا۔ پشت پر کھڑی ہوئی بے انتہا حسین کنیریں سفید طاؤس کے پیروں کے پٹکے اس ادا سے ہلارہی تھیں کہ ان کے نیم برہنہ جسم کا ایک ایک عضو حرکت کر رہا تھا۔ تخت کے بازو میں مظاہر کرسی خالی تھیں۔ سامنے موصل کی سرخ باریک ریشم کی حنائی قباؤں میں روی، ایرانی اور عربی کنیریں اپنی عریانی سے بے نیاز، دف، چنگ، نے، بریط، طنبورہ، کمنجہ، قانون، ارگن، المعزہ، سلباق، شیر دو اور انقیارہ لئے کھڑی بیٹھی اور نیم دراز تھیں۔ شامیانے کے سامنے وہ مشہور عالم باغ لگا تھا جس کی زمینیں رو بہیلی اور سنہری تھیں۔ کیاریاں سنہری، درخت چاندی کے اور پھل پتے سونے اور جواہرات کے تھے اور روشیں مشک و عنبر اور زعفران سے کالی گئی تھیں۔ ایک طرف سونے کا

”تم کون ہو؟“

”ہم کسی زمانے میں انسان ہوا کرتے تھے لیکن اب مٹی کے ڈھیلوں سے بھی سستے ہیں۔ خجروں سے بھی بدتر ہیں یعنی عیسائی لشکروں کی اجاڑی ہوئی رعایا ہیں، آپ کی رعایا ہیں۔“

”کہاں سے آئے ہو؟“

”صور سے۔“

”ہوں..... ہمارے ساتھ آؤ۔“

پشت پر کھڑی ہوئی غلاموں کی قطار کو حکم ملا۔

قافلہ ہمارا اہمان ہے اور رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائے گا۔“

وزارت عظمیٰ کی بارگاہ خاص کی مسند پر اسے بٹھایا گیا۔ چاندی کی سیلانچی میں ہاتھ دھلائے گئے اور دسترخوان پر وہ سب کچھ جن دیا گیا جو فرعون مصر کے وزیر اعظم کو میسر ہو سکتا تھا۔ بڑھا کھانا کھاتا رہا، روتا رہا۔ جب پیٹ بھر گیا اور نارنگیلی پیش کی گئی تب بولا۔

”عالی جاہ..... ہم عیسائی ہیں..... اس لئے کہ ہم عیسائی گھروں میں پیدا ہوئے۔“

جہاں تک واقعی مذہب کا سوال ہے تو ہمارا مذہب ہے بھوک، اردنی اور مصیبت۔ ہم جو اپنے بچوں کا دوزخ بھرنے کے لئے خجروں کی طرح محنت کرتے ہیں اور آدھا پیٹ کھا کر سوراہتے ہیں روح القدس کی صفات کیا جانیں۔ وحدانیت اور تلیث کے رسوز کیا سمجھیں۔ مدتیں ہو گئیں عالی جاہ جس طرح حاکم عیسائیوں کے گھوڑے ہمارے کھیتوں میں رہتے ہیں اس طرح ہم خود اپنے گھروں میں نہیں رہ سکتے۔ ہمارے جسم لباس کی لذت فراموش کر چکے۔

زبان ذائقہ بھول چکی۔ ہم چشموں سے پیاسے لوٹ آتے ہیں کہ حاکموں کے جانوروں کی بے حرمتی کے سزاوار نہ ٹھہرائے جائیں۔ ہم اپنے بیٹے اس لئے پالتے ہیں کہ وہ اپنے سینے تیر اندازی کی مشق کرتے ہوئے عیسائی حاکموں کے تیروں کا ہدف بنائیں، گردنیں آوارہ عیسائی لونڈوں کی تلواروں کے خلاف ہو جائیں۔ ہم بیٹیاں اس لئے پیدا کرتے ہیں کہ وہ اپنی بے کس ماؤں، مجبور باپوں اور مقتول بھائیوں کی آنکھوں کے سامنے عیسائی حاکموں کی نفسانی آگ بجھائیں۔“

”عالی جاہ! ہم کو اب قیامت کا انتظار نہیں رہا۔“

”وہ ہمارے لئے آچکی۔“

”ہمارے سردوں سے گزر چکی۔“

اس نے اپنے طلسمیں شعلے سے آنکھیں پوچھیں۔ ذہین سائل ہاتھ باندھ کر کھڑا

ہو گیا۔ اس نے اپنا مہر وزارت سے مرصع ہاتھ بوڑھے کے کمر و رشتا پر رکھ دیا اور اعلان کیا۔

”تمہاری گردنیں تلوار کا غلاف بن چکیں لیکن رب العالمین کی قسم ایک ایک

گردن کا ایک ایک ہزار گردن سے حساب ہوگا۔“

بوڑھا سائل آنسوؤں کی نذر قدموں پر بچھا کر کے چلا گیا۔ اس کا ہاتھ تلوار کے

قبضے پر اسی طرح جمار ہا۔ فریاد اسی طرح کانوں میں زہر پڑ گئی رہی اور آنکھوں میں امیر المومنین

کا دربار ناچتا رہا۔ نماز مغرب کے بعد سنگ مرمر کی دیوار پر آب زر سے بنے ہوئے نقشے

میں وہ صورت کشہر دیکھ رہا تھا کہ قیامت نے افسر البرید (خفیہ پولیس اور محکمہ ڈاک کا ناظم اعلیٰ)

کی آمد کی اطلاع دی۔ اس نے آتے ہی ایک سرخ لفافہ ہاتھ کی کشتی پر رکھ کر پیش کیا۔ اس

نے گردن ہلا دی۔ افسر البرید نے مہر توڑ کر پڑھنا شروع کیا۔

”کلمہ محرم الحرام ۱۲۷۵ھ کی صبح کو غزہ پر یروشلم کی شاہی فوجوں نے

بلد بول دیا۔ جامع مسجد میں آگ لگا دی، قرآن مجید کی جلدیں پھونک

دیں۔ عیسائی اور مسلمان آباد کو کیتر تیغ کر دیا۔ تکیلیں اور جولان عورتیں

تقسیم ہو چکیں، بچے غلام بنائے گئے۔ بوڑھے اور زخمی مضافات میں

ہجرت کر گئے۔ فوج اب اُن بستیوں کے گرد گھیرا ڈال رہی ہے اور

قتل عام کی تیاری کر رہی ہے۔ صبار قاتر قاصدوں کے ذریعہ وزارت

عظمیٰ کو مطلع کیا جاتا ہے۔

(مہر برائے) خادم البرید ۲ محرم الحرام ۱۲۷۵ھ

وہ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر تائی بجائی۔ غلام کو حکم دیا۔

”امیر عساکر..... افسر الشرط..... اور میر عدل کو طلب کیا جائے۔“

افسر البرید نے پیشانی کی شکن سے بہت کچھ سمجھ لیا اور گزارش کی۔

”بارگاہ خلافت سے حضور کی دایبسی کے انداز کو امیر المومنین نے ناپسند فرمایا ہے۔ خواجہ سراجیم سے تجلیے میں گفتگو فرمائی۔ خاندان کے معتب بزرگوں کے ساتھ عصر کی نماز ادا کی۔ اس کا امکان ہے کہ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں کسی سیاسی طوفان کا پیش خیمہ بن جائیں۔ قاہرہ کے مصافحات میں وہ ہزاروں سوڈانی شمشیر زن موجود ہیں جنہوں نے صدیوں خلافت کی خدمت کی ہے اور جن کو آپ نے معزول کر دیا ہے۔“

اس کی سوچ گہری ہوگی۔

سنگ مرمر کے چبوترے پر قالینوں کا فرش تھا۔ آہنوی کرسیوں کا سیمیں کام قد آدم شمعدانوں کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ آسمان پر چاند روشن تھا۔ چبوترے کے نیچے چاروں طرف سنگ سیاہ کی نہر سے پانی اچھل رہا تھا جس پر سنگ مرمر کا چھوٹا سا پل تھا اور جس کی آخری سیڑھی سبزے پر رکھی تھی اور انجیروں کے جھنڈ کے پاس مسلح ترکمانوں کا ہجوم کھڑا تھا۔ آگے آگے میر عدل قاضی عماد الدین تھے جن کے سفید عمامے اور سفید جینے پر سیاہ داڑھی نے وجاہت کو دو چند کر دیا تھا۔ ان کے پیچھے امیر لشکر ملک العادل تھے جن کے طرز پوش میں بکھراج کی کلفتی لگی تھی اور تلوار کا زر کا زریام زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ ان کی پشت پر امیر الشرط طفل تھے جو لوہے میں جکڑے جوانی کے نشے میں چور جھومتے چلے آ رہے تھے۔ اس نے کھڑے ہو کر آنے والوں کو تعظیم دی اور وہ تینوں دست بوسی کر کے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ رسی گفتگو کے بعد اس نے معاملے کی بات چھیڑی۔

”ہماری سرحدوں پر مسلمان بستیوں کی حالت قابل رحم ہو چکی ہے۔ اجڑے ہوئے قاتلوں کی داستانوں نے ممالک محروسہ کے اسلامیوں پر انجیروں کی ہیبت بٹھادی ہے۔ اندیشہ ہے کہ اس صورت حال سے پوری ملت بے حس نہ ہو جائے اور اپنی بد حالی پر قانع ہو رہے اس لئے ضرورت ہے کہ ایک جزار لشکر جائے اور عیسائی شہروں کو ہمارا ادب کرنا سکھائے۔“

”اس کے لئے آپ نے اتنا اہتمام کیوں کیا۔ کسی غلام کو حکم دیتے اور ہم گھوڑوں پر سوار ہو جاتے، لیکن قاضی عماد الدین خاموش بیٹھے رہے اور ان کی داڑھی جینے کے زرد گر بیان پر ہلکتی رہی۔

”مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں۔ امیر عسا کہ اور انشر الشرط مجھے معاف کریں۔ اگر دس بیس ہزار کا لشکر جاتا ہے تو اس کا خطرہ ہے کہ وہ ساحل کے عیسائی قلعوں کے زنجیرے میں پھنس کر غارت ہو جائے اور انجیروں کا فاتح لشکر قاہرہ کی دیواروں کے نیچے موہیں مارنے لگے اور اگر جزار لشکر روانہ ہوتا ہے یعنی پچاس ہزار سوار کوچ کرتے ہیں۔ تو میرا خیال ہے کہ گھات میں بیٹھا ہوا حرایم، جہازیوں میں چھپے ہوئے سوڈانی سوار اور ناطیوں کے خزانے سازش کر لیں گے اور وزیر اعظم کو کسی دوسرے اور مضبوط شادر سے پٹنا پڑے گا۔“

”دشمن سے لشکر مانگوں؟“

”دشمن کا سلطان دزیر اعظم کی بڑھتی ہوئی شہرت سے خائف ہے اور وہ خود آپ کی رکاب کے شامی لشکر کی دایبسی کا بہانہ ڈھونڈ رہا ہے۔ مجھے توقع نہیں کہ وہ مزید لشکر دے گا اور اس کی کیا ضمانت ہے کہ آنے والا لشکر آپ کے بازوؤں کی طاقت بننے کے بجائے مصر کے تخت پر قبضے کا منصوبہ نہ بنائے گا۔“

”پھر میں کیا کروں میر عدل؟“

”آپ وہی کیجئے جو بار بار عرض کیا جا چکا ہے اور آپ جسے بار بار نظر انداز کر چکے ہیں۔“

”یعنی؟“

”یعنی قاضی خلافت کی پرانی مسند لپیٹ کر کوئے میں رکھ دیجئے۔ بیمار عاضد (خلیفہ) کو کل کی عورتوں کے حوالے کر دیجئے اور مصر کے تخت پر اپنا نیزہ گاڑ دیجئے اور جامع مسجد میں نور الدین محمود اور خلیفہ عباسی کا خطبہ پڑھا دیجئے اور بادشاہوں کے تخت اور عوام کے دل اپنی مٹھی میں کر لیجئے۔ پھر یروشلیم پر فیصلہ کن چڑھائی کا منصوبہ بنائیے۔“

پھر اسی چبوترے پر عشاء کی نماز ہوئی اور قرآن مجید پڑھا تھا رکھ کر قسمیں کھائی گئیں اور ساری رات مملوکوں کے گھوڑے دوڑتے رہے اور صبح ہوتے ہوتے حرایم اور خلافت کے حقداروں کو حراست میں لے لیا گیا۔ قصر کبیر کی فوجیں بے دست و پا کر دی گئیں۔ پھانگوں، غلام گردشوں، ستونوں، مورچوں اور دمدموں پر ترکمانوں کی تلواریں کھڑی کر دی گئیں اور اس وقت جب عیاش امیر المومنین کے بیمار ہاتھوں میں دوا کا پیالہ اور پیروں کے نیچے ردی

کنیزوں کے برہنہ بدن لرز رہے تھے قاہرہ کی جامع مسجد کے منبر پر موصول کے قاضی القضاۃ مصمام الدین خطبہ پڑھ رہے تھے اور خلیفہ بغداد کے حق میں دعا کر رہے تھے۔

تین صدیوں کی خلافت ختم ہوگئی اور اتنی آواز بھی نہ ہوئی جتنی دو جانوروں کے ٹکرانے میں ہوتی ہے۔ تیسرے دن اس انقلاب سے لاعلم عاصد کا انتقال ہو گیا اور قیراط نے اس کے سامنے شہنشاہیت کی جمع کی ہوئی دولت ڈھیر کر دی جس میں ایک زمرہ بارہ انگشت کا تھا اور ایک یا قوت ”جبل نور“ دو ہزار چار سو قیراط کے وزن کا تھا۔ موتی، ہیرے، نیلم اور پکھراج اس طرح ڈھیر تھے جیسے منڈی میں اناج کے انبار لگے ہوتے ہیں۔ سونے کے تخت، پانگ کرسیاں، تپائیاں، شیر، چیتے، مرغ، طاؤس، گھوڑے، مینڈھے سب سامنے لائے گئے۔ سونے اور چاندی کے ستونوں کے اُن گنت شامیانے اور پچاس ہزار صرّ قبضوں کی تلواریں، مشک و عنبر کی ہزار ہا چیزیں، ہاتھی دانت، صندل اور آبنوس کو موم کی طرح ڈھال کر محیر العقول صنّاعی سے بنایا ہوا سامان اس کے سامنے سے گزارا گیا۔ وہ قالینوں، دیوار پوشوں اور فانوسوں کی چھوٹی سی پہاڑی کے پاس کھڑا تھا کہ اگر ایلینو رنے اس مال کا دسواں حصّہ بھی دیکھ لیا ہوتا تو..... اور اس سے زیادہ وہ سوچنے پر رضامند نہ ہوسکا اور خلیفہ راشد کی تقلید میں یہ تمام سامان سپاہ اور عوام میں کھڑے کھڑے تقسیم کر دیا اور عجائبات سے سجے ہوئے قصر الکبیر کی سکونت اپنے امیروں کو عطا کر دی اور خود یرد شلم پر چڑھائی کے سامان کے لئے افریقہ میں ابریم تک اور یمن سے نغز تک زیرنگیں کر لیا۔

پھر شام و جزیرے کا سلطان آقا نور الدین محمود زنگی کا انتقال ہو گیا اور ساری حکومت خود مختاری کا دم بھرنے لگی۔ ان کا گیارہ برس کا بیٹا حلب کے لالچی امیر گمشدگیں کی تولیت میں تخت و تاج سے کھیلنے لگا اور موصول سے یرد شلم تک سازش کے بادل اُٹھائے جو مصر کے اٹھتے ہوئے آفتاب کو غروب کر دینا چاہتے تھے۔ اس کے خون میں سپہ سالاری نے حکم لگایا کہ اگر ان چھوٹے چھوٹے لشکروں کو نہ سنبھالا گیا تو ایک دن بحرّہ خاربین کو بغداد سے مدینہ تک ٹوٹے پھوٹے جہازوں کو ڈوب دیں گے۔ وہ چیدہ سواروں کو رکاب میں لے کر اڑا۔ قلعوں اور شہروں کو شکار کرتا ہوا دمشق کے دروازے پر جا پہنچا۔ امیر دمشق نے تخت حکومت پیش کر کے قصر خالی کر دیا جسے ٹھکرا کر وہ اپنے باپ ایوب کے دروازے پر جا پہنچا۔ داد و بخش

کرتا اٹھا اور حلب کے دروازے کو کھلنے کا حکم دیا۔ حلب آقا زادے صالح کا دار الحکومت تھا اور گمشدگیں کے ہاتھوں میں سونے کا انڈا دینے والی مرغی بنا ہوا تھا۔ حلب کے دروازے مسلمانوں کی تقدیر کی طرح بند رہے۔ پھر سات آنٹھ برس کا صالح تاج پہن کر اور گمشدگیں کی انگلی تھام کر شہر کے برج پر آیا اور رعایا سے دروازے پڑے ہوئے لشکر کو ہٹا دینے کی درخواست کی۔ اس کے آنسوؤں نے مدافعت کو شعلہ سامان کر دیا۔ تب اس نے بغداد اور قریطانہ کے درمیان سب سے بڑے سپاہی سے مصر سے ملک طلب کی اور دمشق کو چھیننے اور بابے مہیا کرنے کا حکم دیا۔ حلب کا قلعہ ایک گول نیکی چکنی پہاڑی پر تھا جو ارد گرد کی ہموار سطح سے کئی ہزار فٹ بلند تھی۔ موسم سرما سردی پر تھا۔ پہاڑوں کی چوٹیاں سفید دلائیاں اڑ رہے کانپ رہی تھیں۔ حلب کے چاروں طرف پھیلی ہوئی فوج الاوردش کئے ملک کا انتظار کر رہی تھی کہ ایک خط گرفتار ہو کر پیش ہوا جس میں گمشدگیں نے طرابلس کے نواب ریمینڈ اور یرد شلم کے بادشاہ کو لکھا تھا۔

”امیر طرابلس اور شاہ یرد شلم کو معاہدے کی اولین دفعہ کے مطابق مطلع کیا جاتا ہے کہ مصر کا غاصب بادشاہ یوسف ابن ایوب ہمارے صوبوں کو غارت کرتا ہوا دار الحکومت پر چڑھ آیا ہے۔ آپ دوسرے حلیف شاہ حقلیہ کی امداد لے کر اس کی پشت پر حملہ کریں۔ ہم کیفا اور مارون کے فرمانروا اشارے کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ آپ کے حرکت کرتے ہی فاطمی مصر دبا لیں گے اور ہم یلغار کریں گے۔ تاکید سے مطلع کیا جاتا ہے کہ یوسف ابن ایوب جو مصر، سوڈان اور یمن فتح کر چکا ہے شام اور جزیرے کے بعد یرد شلم کی طرف متوجہ ہوگا۔ وہ مشرق کی شہنشاہی کا خواب دیکھ رہا ہے۔ آپ اس معاملے کی سنگینی پر توجہ دیں۔

مہر برائے

گمشدگیں اتالیق سلطنت جزیرہ و شام

خط پر صالح اور گمشدگیں کی دوہری مہریں تھیں۔ اس کو وہ سازش یاد آگئی

جس میں صقلیہ کا بحری بیڑہ، یروشلم کی مرکب سوار فوجیں اور فاطمیوں کی دولت نے ایک ساتھ شریک ہو کر اس کی بربادی کا دام بچھایا تھا۔ وہ خط میر عدل کے حوالے کر کے انتظام میں مصروف ہو گیا۔ پھر پرچہ لگا کر ریمینڈ نے حصہ کو لے لیا۔ حصہ جو اس کا اسلحہ خانہ اور رسد گاہ تھا۔ اس نے مجبور ہو کر محاصرہ اٹھایا اور آندھی کی طرح حصہ پر چلا اور ریمینڈ کے چالیس ہزار لشکر سے ایک ایک گردن کا حساب کیا۔ بعلبک کے مشہور عیسائی قلعے کو خون میں نہلا کر اور برف پوش سورجوں کو لالہ زار بنا کر چلا تو دریائے عاصی کے کنارے موصل، حلب، کیفا اور مار دین کے متحدہ لشکر کا سامنا ہوا یعنی عہد نامے کی دوسری شق پوری ہوئی۔ اس سازش کا جس میں مذہب و ملت کی قید اٹھ چکی تھی، دوسرا قدم سامنے تھا۔ امیر ابن بارگاہ نے گزارش کی کہ تازہ دم لشکر کا انتظار کیا جائے لیکن جلاوت نے گوارہ نہ کیا اور گھوڑے اٹھادیے اور ایک ہی یلغار میں میدان چھین لیا۔ دمشق آ کر صالح کا نام خطبے سے اڑایا اور اپنا خطبہ پڑھایا۔ سکے مضروب کرایا اور صلاح الدین کا لقب اختیار کر کے تاج پہن لیا۔ دوسری بار حلب پر چڑھائی کر دی۔ مکمل ناکہ بندی کر کے شہر لے لیا اور قلعے کی دیواروں پر تحقیقیں لگا دیں اور طفل اور طفلی گئیں کو قہر ناک فوجیں دے کر کیفا اور مار دین کی گوشائی کے لئے روانہ کیا اور خود اپنی کمان میں لشکر کی موجیں قلعے کی برف پوش چوٹیوں پر چڑھادیں اور یقین کیا کہ صبح تک فتح قدموں میں پڑی ہوگی۔

حلب کی پہاڑی پر واقع زرد شاہی بارگاہ پر زرد پرچم لہرا رہا تھا۔ اندر وہ آہنوس کی کرسی پر بیٹھا تھا جس کے پایوں پر ہاتھی دانت کا کام تھا اور جوہرن کے سنگوں کی طرح باہر کی طرف نکلے ہوئے تھے جس کے دستوں اور پشت پر زرد مخمل چڑھا تھا اور نیکیے پر چاندی کا فرامشی مریض تاج رکھا تھا۔ سامنے یمن میں تربیت کیا ہوا وہ بچھڑا کھڑا تھا جو ایلینور کے بخشے ہوئے گھوڑے سے نسل کشی میں نصیب ہوا تھا اور جو اپنے باپ کی طرح شوکت کا اظہار کر رہا تھا اور جس کی ازاؤں سے وہ محظوظ ہو رہا تھا کہ سامنے کھڑے ہوئے ذات خاص کے رسالے کے سپاہی نے خنجر نکال کر اپنے سینے پر رکھ لیا اور گرج کر بولا۔

”شیخ الجبال کے حکم کے مطابق آپ محاصرہ اٹھالیں ورنہ قتل ہو جائیں گے۔“

آخر لفظ کے ساتھ خنجر سینے میں تیر گیا اور وہ تڑپنے لگا اور ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ دم بخود

بیٹھا۔ پھر تفتیش ہوئی۔ پتہ چلا کہ اس فدائی نے ذات خاص کے سپاہی کا بہروپ بھرا اور اصلی سپاہی کو قتل کر کے خود اس کی خدمت انجام دینے لگا اور آج موقع پا کر یہ حرکت کی۔ بارگاہ پر زبردست پہرا قائم ہو گیا۔ تاج الملوک (ایک بھائی) بکتر پہن کر دروازے پر نصب ہو گئے۔ وہ اپنے خیالوں میں گم تجدد کی نماز کے لئے اٹھا۔ سلام پھیر کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تھے کہ مدتوں کے وفادار خادم نے پھر اچلا دیا جسے طربوش کے نیچے لوہے کی کڑیوں نے روک لیا۔ دوسرے وار کو ہاتھوں پر سنبھالا اور تیسرے وار سے پہلے تاج الملوک نے اس کے نکلنے سے روک دیا۔ مقتول بھی ترکان خادم کے بھیس میں فدائی نکلا۔ سارے لشکر میں سنسنی پھیل گئی۔ بڑے بڑے جلیل الشان سردار گھوڑوں پر سوار ہو کر ایک ایک آدمی کو کھوجتے پھرے۔ آخر ایک ترکان نے نام و نسب کے سوال پر ہنکے ہنکے جواب دیے اور گرفتار ہوا اور پیش کیا گیا۔ اسے اپنی مسند پر بٹھا کر قرآن مجید پر ہاتھ رکھوایا اور قسم کھلائی کہ اگر اس نے سچ سچ ساری روداد سنائی تو جان بخشی کر دی جائے گی ورنہ ایسی سزا ملے گی کہ جہنم کے عفریت کانپ اٹھیں گے۔ وہ تھوڑی دیر گم سم بیٹھا رہا۔ پھر بولا۔

”میرا نام صہیب ہے۔ میں مشہد میں پیدا ہوا۔ سترہ برس کی عمر میں دستار باندھی

گئی اور مصیاف کی نظامت میں ملازمت ہو گیا۔ دن میں قلم گھستا اور رات میں شعر کہتا۔

زندگی بھلی بری گزر رہی تھی۔ اس وقت تک میری کوئی نماز قضا نہ ہوئی تھی، کوئی روزہ سا قضا نہ

ہوا تھا۔ پھر میں اپنے ایک ہم پیشہ سے قریب ہو گیا۔ جب دوستی بڑھتی گئی تو میں نے اس

سے پوچھا کہ تم نماز کیوں نہیں پڑھتے۔ اس نے جواب دیا نماز وہ پڑھیں جو مرنے کے بعد

جنت حاصل کرنا چاہیں۔ میں تو زندگی ہی میں جنتی ہو چکا۔ اس جواب سے مجھ پر حیرت کی

بجلی گر پڑی۔ جب میں نے تفصیل چاہی تو وہ مکر گیا۔ آخر میں جستجو کی آگ میں پھنکنے لگا اور

ایک دن اپنے آپ کو میں نے اس کے قدموں میں ڈال دیا۔ اس نے مجھے قبول کر لیا اور کہا

کہ کل شام کو میرے پاس آنا۔ میں سہ پہر ہی سے اس کے گھر جا کر بیٹھ گیا۔ مغرب کے بعد

وہ گھر سے نکلا اور مصیاف کے قلعے کی تفصیل کے نیچے بنے ہوئے مکانوں میں سے ایک

مکان میں داخل ہو گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہیں ایک کمرے میں اس نے میری

آنکھوں پر مٹی باندھی اور میرا ہاتھ پکڑ کر چلا۔ میں کوئی دو گھنٹی تک چلتا رہا اور جب مٹی کھلی

تو میں ایک کمرے میں تھا جس میں سفید چاندی کا فرش تھا، چھت پر فانوس روشن تھے، طاقتوں میں غوددان ہبک رہے تھے اور مسند پر ایک بزرگ مستکن تھے جو سفید عبا اور عمامہ پہنے تھے۔ ان کی داڑھی عمامے سے زیادہ سفید تھی اور آنکھوں میں ستارے جل رہے تھے۔ میں نے۔ ایسی پر جلال صورتیں زندگی میں دو چاری دیکھی تھیں۔ میں بے خود ہو کر ان کے سامنے دوڑا نو بیٹھ گیا۔ ان کے نصف چہرے کے نقاب کا آخری سرا ان کے دونوں سفید ہاتھوں تک لمبا تھا۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھ دیا اور میں بے خود ہونے لگا۔ پھر انھوں نے چاندی کا ایک لانا گلاس مجھے عنایت کیا جو برف سے زیادہ ٹھنڈا، دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا تھا۔ میں نے ایک گھونٹ پیا۔ انھوں نے گلاس میرے ہاتھ سے لے لیا اور اپنا نقاب میرے سر پر ڈال دیا۔ اب مجھ پر رقت جاری ہوئی، ہچکیاں بندھ گئیں اور گریبان آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ انھوں نے نقاب اٹھالیا اور گلاس میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ میں نے پورا پی لیا۔ میری روح تسکین اور طمانیت سے میر ہو گئی اور میں نے پھر ان کے مقدس ہاتھوں پر سر رکھ دیا۔ اب دنیا کے گھناؤنے پردے ہٹ چکے تھے اور میں جنت میں تھا۔ میرا محل چاندی کا تھا۔ تمام ستون، دیوار، محراب، فرش سب کچھ چاندی کا تھا۔ تمام دروازے سونے کے تھے۔ فرش کے قالینوں میں سونے کے تار پروئے ہوئے تھے اور پردوں پر موتی ٹنکے تھے۔ ہر کمرے میں ہر قسم کے کھانے اور شربت جو انسان تصور کر سکتا ہے موجود تھے۔ میں قائم کا لباس، یا قوت کی جوتیاں اور ہیرے کا تاج پہنے ہوئے تھا۔ میرے لباس کو اگر بغداد کا خلیفہ دیکھ لیتا تو بھوک پیاس اڑ جاتی۔ دروازوں پر غلمان کھڑے تھے جو موتیوں کے عمامے اور ہیرے کی پاپوش پہنے ہوئے تھے اور ان کے جسم سے ایسی خوشبو اٹھ رہی تھی جس کی نظیر نہیں ہو سکتی۔ میں جب ان کے سامنے سے گزرتا تو وہ جھک جھک کر سلام کرتے۔ پھر حوروں کا ایک پرا آیا، جن کی صورتوں کا انسان تصور نہیں کر سکتا۔ میں کسی کے حسن کو بیان نہیں کر سکتا۔ سب لامثال تھیں۔ ان میں سانولی، سفید، زرد، سرخ، ہر رنگ کی تھیں۔ سب کے شانوں پر پر تھے جن میں عقیق کی جھالیں لگی تھیں۔ ان کے جسم پر کپڑے کے بجائے ہیرے، نلیم، عقیق، زمرد، فیروزہ، پکھراج اور موتی کے ہار اس طرح لپٹے ہوئے تھے کہ ستر پوشی ہو گئی تھی۔ وہ جب آئیں تو میں بدحواس ہو گیا لیکن وہ سب میرا طواف کر کے

مجھ سے بے تکلف ہو گئیں۔ کوئی میرے بالوں سے کھیلنے لگی، کوئی میرے شانوں سے جھول گئی۔ ان کے منہ سے عطر اور جسم سے مشک کی خوشبو آرہی تھی۔ میں ان کی بہار حسن کی گل چینی کرتا رہا اور اپنے پیر کو دعا دیتا رہا۔ پھر مجھے وہ بارغ میں لائیں جس کی زمین مشک کی تھی، کیا ریاں زعفران کی، درخت چاندی کے، شاخیں سونے کی، پھل، پھول اور پتے عقیق و زمرد کے تھے۔ اس کے بیچ میں شیشے کی نہریں تھیں جن میں شہد، دودھ اور شراب بہہ رہی تھی۔ ان کے کنارے ہاتھی دانت کے تخت بچھے ہوئے تھے جن پر حوریں لیٹی بیٹھی تھیں جو مجھ پر نچھاور ہوئی جا رہی تھیں۔ ان میں سے کسی کے سر پر نقل کی کشتی، کسی کے کاندھے پر شراب کا کدو تھا اور کسی کی چمیلی کمر پر شراب سرخ کی بتوریں صراحی تھی جس کے عکس سے اس کے عریاں کو لھے جو خود شراب کے قرا بے تھے، سرخ ہو گئے تھے۔ کچھ کے ہاتھوں میں موسیقی کے آسانی آلات تھے جن سے ملکوتی نغمے پھوٹ رہے تھے۔ پھر وہ گنگنا نے لگیں۔ ایک نے تان لگائی اور مجھے محسوس ہوا کہ میرا دل سینہ توڑ کر نکل جائے گا۔ پھر ایک حور نے ناچنا شروع کر دیا اور معلوم ہوا کہ اس کے رقص کے سحر سے زمین و آسمان لکرا کر چور چور ہو جائیں گے۔ میرے پہلو سے لگی ہوئی حور نے دوسری حور کی کمر سے صراحی اتاری اور شعب کے پیالے میں ڈھال کر مجھے دیا۔ وہ شراب طہور تھی جو مزے میں شہد سے شیریں تر، برف سے سرد اور تیزی میں آگ سے کہیں تیز اور رنگ میں دودھ سے سفید تھی۔ میں نے دوسرا پیالہ مانگا، اس نے دیا۔ میں نے تیسرا پیالہ بھی سیر ہو کر پیا۔ پھر رقص اپنے عروج پر پہنچ گیا اور زمین و آسمان چکرا گئے۔ جب ہوش آیا میں اپنے مکان میں پڑا تھا۔

”سلطان اعظم!“

”جنت میں گزرے ہوئے تھوڑے سے لمحے یہاں کے کئی دنوں سے بھی لمبے تھے۔ میرے دوست نے بھی حساب لگا کر بتایا لیکن نہ مجھے اجابت محسوس ہوئی اور نہ استیجہ کی خواہش ہوئی۔ اب دنیا میری نگاہ میں تاریک تھی۔ نہ دن کو سکون، نہ رات کو قرار۔ بس ایک آرزو تھی جو بے قرار کئے ہوئے تھی یعنی جنت کے ان چند لمحوں کا دوبارہ حصول۔ بڑے ریاض کے بعد پھر اپنے شیخ کے حضور میں باریابی ہوئی۔ شیخ نے دست بوسی کے بعد ایک خنجر عنایت کیا اور حکم دیا کہ اس کی مہارت حاصل کروں۔ میں کرفنون جنگ سے آشنا تھا چند ہی

دلوں کی کوشش میں ایسا کامل ہو گیا کہ انسان کے جس حصے کے جس رد میں کو چاہوں تراش لوں۔ پھر مجھے حکم ہوا کہ بغداد کے میر عدل کو جس نے ہمارے شیخ الجبال سے گستاخی کی تھی، جہنم پہنچا دوں۔ میں نے اپنے شیخ کے مریدوں کی مدد سے میر عدل کے محافظوں میں سے ایک کا بہرہ روپ بھر اور اس محافظ کو اس کے مکان سے غائب کر کے میر عدل کی خواب گاہ پر پہرہ دینے کھڑا ہو گیا اور موقع ملنے ہی اس کے کھڑے کر دیئے۔ میں شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر انعام جنت حاصل کرنے کو تھا کہ دوسرا حکم پہنچا کہ پر خنجر چلاؤں اور ساری عمر کے لئے جنت میں داخل ہو جاؤں۔ میں جو جنت میں داخلے کی کوشش سے زیادہ وہاں سے نکلنے کے اندیشے سے مضطرب تھا سرور ہو گیا اور سلطان اعظم کے لشکر میں ترکمان کا بھیج بنا کر داخل ہو گیا۔

”لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہمارے جاسوسوں نے تجھے تلاش کر لیا۔“

تاج الملوک نے لقمہ دیا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے نگاہ اٹھائی۔ فدائی نے گردن جھکائی۔

”اپنے مرشد اور الموت کے ساحر سے پوچھنا کہ اس کی جھولی میں کوئی ایسا بھی خنجر ہے جو کرک کے رہزن، طرابلس کے ڈاکو اور بیت المقدس کے غاصب پر بھی چمک سکے یا اس کی ملعون آستین میں وہی پلید پھرے ہیں جو افریقیوں سے نبرد آزما لشکروں پر چلا کرتے ہیں۔ اس مار آستین کو شاید علم بھی نہ ہو کہ فلسطین کے فاتح عیسائی لشکر نہیں، اس کے کبخت خنجر ہیں۔ ہم تیری زندگی کی حفاظت کریں گے تاکہ تو اس پہاڑی چوہے کو ہمارا پیغام پہنچا سکے کہ ہم شیروں کی طرح لٹکا کر شکار پر چھپتے ہیں۔ اس کو خبردار کر دو کہ اپنے لشکروں کو استوار کر لے، اپنے قلعوں کو آراستہ کر لے۔ ہماری یلغار اُن تاجداروں کا محاصرہ نہیں جو موت کے خوف سے اپنے لشکر اٹھا لائے۔ ہم جب رکاب میں پاؤں رکھتے ہیں تو اس یقین کے ساتھ کہ شہادت ہماری رکاب پکڑے گی اور رضوان ہمیں اپار لے گا۔ ہماری موت لڑائی کا خاتمہ نہ ہوگی۔ ہمارا ہر سردار صلاح الدین ہو گا جسے اس کے زمانے نے تلوار پکڑا کر اٹھایا ہے۔ ہمارے جلو میں زریفت کے لباسوں اور جواہرات میں لپٹے ہوئے امیرورمیں نہیں ہیں جو عزت کی موت اور ذلت کی زندگی کا فرق نہیں جانتے۔ ہماری رکاب

میں وہ مجاہد ہیں جو موت کی جستجو میں دشمن کی صفیں چھاننے گھومتے ہیں۔ جاؤ اور خدا نے چاہا تو اسی مہینے الموت کے دروازے پر تمہارے شیخ الجبال کی لاش لٹک رہی ہوگی۔“

مصر کے نائب السلطنت کو فرمان لکھا کہ فاطمیوں کے خلاف تلوار پر گرفت مضبوط رکھو۔ سپہ سالار عادل کو قاتر فوجوں کے ساتھ حکم دیا کہ افریقیوں کی سرحدی بستی میں تہلکہ ڈال دے اور خود دس ہزار خنجروں پر قلعہ حکمن آلات بار کئے اور بارہ ہزار سوار یوں کے ساتھ بادل کی طرح اٹھا اور خیشیوں کے مرکز پر بجلی کی طرح گرا۔ وہ تاریک جنگل جن کی ناقابل عبور دریائی شیخ الجبال کی سیرتھی جلا کر خاک کر دیئے۔ وہ آبادیاں جو فدائیوں کا اسلحہ خانہ اور رسد گاہ تھیں تہ دبالا کر دیں۔ وہ فلک بوس قلعے جن تک پہنچتے پہنچتے عقاب تھک جاتے تھے اور جن کے برج میں بیٹھ کر شیخ الجبال مصر سے خوار زم تک اور افریقہ سے یمن تک کے بادشاہوں کو احکام لکھا کرتا تھا، زبرد بر کر ڈالے۔ مصیاف کے قلعے کی طرف جنبش کر رہا تھا جس کا نام آشیانہ عقاب تھا اور جو اسم با مکی تھا۔ سطح زمین سے آسمان کے تارے کی طرح نظر آتا تھا کہ راستے میں شیخ کے سفیر آئے اور گلے میں چادریں ڈال کر اور خالی نیام پہن کر اور دن میں چراغ جلا کر آئے اور پچھلے گناہوں کی معافی کے خواستگار ہوئے۔ جواب دیا گیا کہ ”مصیاف“ کے دربار میں برج پر بیٹھ کر تم سے ملاقات کریں گے اور اس قلعہ کا محاصرہ کر لیا جس کے نیچے سے بڑے بڑے مغرور بادشاہ ایک ایک لاکھ لشکر لے کر ناکام پھرے تھے۔ منتخبین اور دبا بے لادے ہوئے دس ہزار فخر سیدھی چڑھائی پر چڑھتے ہوئے نڈی دل کی طرح فصیل کے چاروں طرف پھیل گئے اور ایک ہی رات میں پانچ سو دبا بے اور دوسو منتخبین پتھروں کی بارش کرنے لگیں۔ شیخ الجبال چوہے کی طرح اپنے بل سے بلبلار کر نکلا اور بغیر کسی شرط کے حضوری کی گزارش کی۔ وہی امیروں کی کانپتی زبانوں کی گڑ گڑاتی وکالت سے عاجز ہو کر باریابی کا شرف بخشا گیا۔

آدھی رات ادھر تھی اور آدھی رات ادھر۔ وہ مدد زرد بارگاہ میں لکڑی کے تختے پر شیر کی کھال بچھائے، کھجور کی چھال کا تکیہ لگائے طربوش اور بکتر پہنے قد آدم شمعوں کی روشنی میں بیٹھا تھا۔ طغرل اور طسفت گین کے آہن پوش ہاتھ ایک بوزھے کا بازو پکڑ کر لائے اور تخت کے سامنے سرخ ندے پر کھڑا کر دیا اور اس کی پشت پر ننگی تلواریں بیک کر کھڑے

ہو گئے وہ بھاری بدن پر ڈھیلا ڈھیلا اطلسیں چنہ پہنے تھا۔ سفید مخرومی ریشی داڑھی ناف تک چلی گئی تھی۔ شانوں پر دودھ میں دھلے گھونگھریالے کیسو پڑے تھے۔ اس بڑھاپے میں بھی چہرے سے خون نچک رہا تھا۔ سر پر سفید اصفہانی پگڑی تھی جس کا شملہ کر کے نیچے پڑا تھا۔ داہنے ہاتھ کی بیچ کی انگلی میں گول نیلم کی بڑی سی انگوٹھی، پیروں میں مجلس کی پاپوش اور آنکھوں میں بے خونی چمک رہی تھی۔

”تو تم ہو وہ شیخ الجبال..... جس نے سارے عالم اسلام میں بزدلانہ خونریزیوں کا جال بچھا رکھا ہے۔“

”سلطانوں کے سلطان! میری ایک گزارش۔“

”شیخ الجبال تمہاری پیشانی پر سجدوں کا نشان ہے اور دامن پر خون کے داغ۔ تم کو ذکیہ کر قرب قیامت کا یقین ہو گیا۔ تم اس قبیلے سے ہو جس کے سینے میں قرآن ہوتا ہے اور زبان غلاظت میں لت پت ہوتی ہے۔ تمہاری بند آنکھوں کے سامنے عیسائی لشکر آتے ہیں۔ مسجدوں میں گھوڑے باندھ کر قرآن پاک بھونک دیتے ہیں۔ مردوں کو قتل کر دیتے ہیں اور عورتوں کو ہانک لے جاتے ہیں اور تم خدا کی جنت میں بیٹھے ہوئے اپنے بڑھاپے کو عورتوں سے بہلایا کرتے ہو اور چہرے چمکایا کرتے ہو۔“

”سلطان اعظم۔“

”تم کرک کے ریحینا لد، طرابلس کے ریمینڈ اور یروشلیم کے بالدون کے حلیف ہو۔ تم نے اپنی اس خونی تنظیم میں جکڑے ہوئے سرفروشوں کو بیت المقدس پر چڑھا دیا ہوتا تو رب العالمین کی قسم ہم تمہارے ہاتھ پر بیعت کر لیتے۔ تمہارے لشکر کے آگے آگے لڑکر مرجانے والے پہلے سپاہی کا نام ”صلاح الدین“ ہوتا لیکن تم نے کچھ کیا تو یہ کہ جب ملت اسلامیہ کے ہاتھوں میں کوئی تلوار چکی تو تم نے اپنے خفیہ خنجر سے اس کو تراش لیا۔ تم صلیبوں کے ہاتھ میں وہ پوشیدہ خنجر ہو جس کے خوف سے مسلمان تاجدار اپنے قلعوں سے نکلنے ڈرتے ہیں اور فرنگی مملکت معظمت تک نو جیس چڑھالاتے ہیں۔“

”سلطان اعظم میری عرضداشت۔“

”تم کو معلوم ہے کہ ہماری نظر میں تمہاری جنت کی کیا وقعت ہے؟ قصر الکبیر کی

بے نظیر عمارتوں میں ہمارے غلام رہتے ہیں۔ وہ خزانے جو قارونوں اور فرعونوں کو خرید لیتے ہم نے اپنے لشکر میں بانٹ دیئے ہیں۔ ہماری نظر میں آفتاب و مانتاب سی عورتیں کھال کھینچے ہوئے دنبوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ ہم نے تین سو برس سے قائم عظیم الشان سلطنت کو اس طرح معزول کر دیا جیسے سپاہی اپنا گھوڑا بدلتا ہے۔ ہمارے بکتر کے نیچے وہ کفن ہے جو ہم نے وزارت عظمیٰ کی قبولیت کے دن پہنا تھا اور یہ کفن اس دن اترے گا جس دن بیت المقدس پر محمدی جھنڈا لہرانے لگا۔ رہا فاطمیوں اور عباسیوں کا سلسلہ تو فاطمی اس لئے نابود کئے گئے کہ وہ بیت المقدس کے راستے میں پہاڑ کی طرح حائل تھے اور اگر عباسیوں نے بھی یہ جسارت کی تو پروردگار کی قسم بغداد کی گلیاں ہمارے لشکر سے چھلک اٹھیں گی۔ بارگاہ خلافت میں ہمارے گھوڑے نرول فرمائیں گے اور امیر المومنین کو بنیذ کے قراہوں میں دفن کر دیا جائے گا۔ شیخ الجبال ہم نہیں چاہتے کہ مسلمانوں پر چڑھ کر اپنا وقت اور ان کی قوت عارت کریں۔ ہم تمہارے دیار کا بھی رخ نہ کرتے۔ اس لئے نہیں کہ ہم تم سے خائف تھے بلکہ اس لئے کہ ہم میدانوں کے شیر ہیں۔ چوہوں کو ان کے بلوں سے نکال کر مارنا شجاعت کی توہین سمجھتے ہیں۔ ہماری آرزو ہے کہ ہم جہاد کرتے ہوئے شہید ہوں لیکن اگر یہ مقدر ہو چکا ہے کہ ہم کسی بزدل ندائی کے چور خنجر کا نشانہ بنیں تو ہم کو یہ موت بھی قبول ہے، لیکن یاد رکھو کہ صلاح الدین کے بعد ایک ایک سپاہی صلاح الدین بن کر کھڑا ہو جائے گا اور تم پر زمین تنگ ہو جائے گی اور تم سے نسبت رکھنے والے گدھے اور گھوڑے تک ذبح کر دیئے جائیں گے۔“

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ شیخ الجبال نے آگے بڑھ کر تخت کے پائے کو بوسہ دیا اور اسے دونوں ہاتھوں سے بکڑ کر ولیوں کی سی آواز میں بولا۔

”خون حسین کی قسم۔ میں نے سلطان اعظم کے قہرمان لشکروں کی حرکت کو شوق جہانبانی پر محمول کیا تھا اور مقابلے پر کھڑا ہوا تھا، لیکن آپ نے آنکھوں کے پردے ہٹا دیئے۔ عہد کرتا ہوں کہ میرے خنجر سلطان اعظم اور اس کے فرمان کی حفاظت کو ایمان سمجھیں گے۔“

”اگر حکم ہو تو مصیاف کا قلعہ مہمان داری کے آداب بجالائے۔“

”نہیں مصیاف کی نعمتیں تمہیں مبارک ہوں، ہماری لئے افرنجیوں کی تلواریں

کافی ہیں۔“

”طغرل!“

”عالی جاہ“

”سپہ سالار کو محاصرہ اٹھالینے کا حکم دو اور شیخ الجبال کو حفاظت سے رخصت کر دو۔“

مصیاف سے حلب تک تمام بے ادب و گستاخ قلعوں اور شہروں کو فتراک نیاز مندی میں باندھتا ہوا وادی جناب کے سبزہ زار میں داخل ہو گیا جہاں سے حلب کے باغوں کی سبز قبائیں اور قلعے کے سفید گنبدوں کے عمارتوں نظر آنے لگتے ہیں۔ گمشدگی کے قاصدوں نے اس کے پہلو میں چلتے ہوئے طغرل کی رکاب چوم کر صلح کی شرائط پیش کیں۔ طغرل نے صلح نامہ کو کھارت سے زمین پر ڈال کر گھوڑے کی ناپوں سے روند دیا اور قاصدوں نے سنا۔

”ہم حلب کے بادشاہ برج میں دربار قائم کر کے فاتح امیروں کو خطیں پہننا کر گمشدگی کی شرطیں سماعت فرمائیں گے۔“

ابھی لشکر اتر رہا تھا کہ خبر آئی۔

”حلب کے دروازے خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔“

ایک پہر آرام کر کے نامی گرامی ملکوں کو جلو میں لے کر قلعے پر چڑھا۔ باب الداخلہ پر زور پرچم لہرا رہا تھا اور فلولادی دروازے کی اندرونی محراب میں اس کے مرحوم آقا سلطان نور الدین محمود زنگی کا خرد سال بیٹا جواہرات سے منڈھاتا تاج اور موتیوں سے منڈھی پاپوش پہنے، جیشی ہاتھوں میں سدھے چھتر سلطانی کے سائے میں تبا کھڑا تھا۔ آقا زادے کی نگاہ اٹھتے ہی گھوڑے سے اتر پڑا۔ عبا کے دامن پر بوسہ دیا اور رکاب تھام کر چلا اور سلطان نور الدین محمود زنگی کے عالی شان محل میں اتر پڑا۔ گمشدگی اور بڑے بڑے سردار جنھوں نے عیسائیوں سے لے کر شیخ الجبال تک اس کے قتل کی سازشیں کی تھیں، گلے میں نکو اور ڈالے اور سینے پر ہاتھ باندھے یہ تماشا دیکھ رہے تھے کہ خدائی کا دعویٰ کرنے والی سلطنت مصر اور بنی امیہ کے شام کا بادشاہ ایک لڑکے کی رکاب تھامے غلاموں کی طرح ادب برتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ گمشدگی کے علاوہ سب کے سلام قبول ہوئے۔ مذہب ستونوں اور سونے سے منڈھی چھت کے ایوان میں دسترخوان بچھا۔ زرکار شیشے کے برتنوں میں نعمتیں چنی گئیں۔

تصویروں سے زیادہ خوبصورت کینریں مہین کپڑے اور سونے زیور پہنے خدمت پر موجود کھڑی تھیں۔ بسم اللہ ہوئی لیکن آقا زادے نے ہاتھ نہ اٹھایا۔ پوچھنے پر جواب دیا۔

”گمشدگی کی جاں بخشی سے قبل ہم کو آپ ددانہ قبول نہیں۔“

فاتح سپہ سالاروں کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں اور سیکڑوں ہاتھ قبضوں پر چلے گئے۔

پھر کس صالح نے سنا۔

”جان آپ کی طرف سے بخشی گئی اور منصب آپ کے والد کے غلام کی طرف

سے عطا کیا گیا۔“

پھر ننھا سا بادشاہ اپنے خدم و حشم کے ساتھ قلعے کی طرف کوچ کر گیا اور اس نے دوسرے دن جمعہ کی نماز کے بعد قلعہ میں جلوس کرنا پسند کیا اور ملک العادل کے ترتیب دیئے جشن فتح میں نزول اجلال فرمایا۔ قصر حلب کے باغ میں وہ شامیانہ نصب ہوا جس کی چھت اور ستون تحمل پوش تھے اور ہزار ہا فانوس، جھاڑ، پنشنائے، شمعیں اور مشعلیں روشن تھیں۔ نر ش پروہ قالمین پڑے تھے جن پر رزم و بزم کے مرتعے چمک رہے تھے۔ سپاہی سے سپہ سالار تک سب کے سب سرخ، نررد، سفید، سیاہ، سادی، دھاری دار، سولی، ریشمی قباؤں، عباؤں اور کفتانوں میں ملیں بیٹھے تھے۔ کیفا کے فرمانروا نور الدین..... مار دین کے حکمران جلال الدین اپنی اپنی افواج کے ساتھ مقبول ہوئے۔ سردار و امیر، والی و عامل، بیادے اور سوار، جوڑے اور گھوڑے، مال و منصب، مرتبے اور جاگیر سے نہال ہوئے۔ پھر اس کے تحت کے سامنے دو عورتیں دف اور کمبجہ بجانے لگیں۔ ایک لڑکی اپنے نصف چہرے پر نقاب ڈالے، بھاری بدن پر ڈھیلانٹوں تک بسا خوبصورت گرتا پہنے، پتلی کرکوری ریشمی رسیوں سے اور پتلی کئے داہنے ہاتھ میں خنجر لئے چیتے کی طرح ہلکے، سبک، بے خوف قدموں سے چلتی ہوئی ناچتی ہوئی آئی اور بیٹھے ہوئے امیروں پر حملہ آور ہونے لگی۔ ہر بار یہ معلوم ہوتا کہ خنجر سر میں پیوست ہو گیا اور ہر بار وہ امیروں کے عماموں کی سطح چاٹ کر چلا آتا۔ وہ نسائی ہاتھ کی مہارت اور قدرت پر محظوظ ہو رہا تھا کہ بارگاہ کا بایاں باز و روشنی سے اور روشن ہو گیا۔ منے سے بادشاہ صالح کی چھوٹی بہن اور مرحوم سلطان کی بیٹی نصف چہروں پر موتیوں کا نقاب ڈالے گھوڑے پر سوار کھڑی تھی۔ وہ تخت سے اس طرح اٹھا جیسے ادنیٰ خادم اپنے جلیل الشان آقا کے سامنے

اٹھتے ہیں۔ شہزادی کو اپنے گود میں لے کر اتارا۔ بیچ تخت پر مسند کا سہارا دے کر بٹھا دیا اور خود اس کے سامنے دو زانو ہو بیٹھا۔ پھر اتنا س کیا۔

”صاحبزادی بلند اقبال نے قلعہ سے برآمد ہوتے کی زحمت کیوں فرمائی۔ کسی غلام کو حکم فرماتیں، ہم ڈیوڑھی پر حاضر ہو جاتے۔“

”ہم آپ سے حلب کا قلعہ مانگتے آئے ہیں۔“

”حلب کا قلعہ آپ کیا کریں گی؟“

”ہم اس میں کھیلے گے۔“

”آقا زادی..... حلب کا قلعہ تو ایک قلعہ ہے۔ اگر آپ نے مصر، شام، یمن یا سوڈان کا تخت مانگا ہوتا تو رب ذوالجلال کی قسم وہ بھی عطا کیا جاتا۔“

پھر دس ہزار دینار سرخ کی نذر پیش کی اور اراکین حکومت کو اشارہ کر کے نذر میں گزاریں۔ گود میں لے کر گھوڑے پر سوار کرایا۔ طغرل اور تاج الملوک کو چھتر و جنور دیا۔ خود گزیا کی طرح بیٹھی ہوئی شہزادی کی رکاب تھام کر پایادہ چلے۔ پشت پر تیس ہزار کا فاتح لشکر اس طرح چل رہا تھا جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہوں۔ حلب کے عوام وہ وقت یاد کر رہے تھے جب مرحوم سلطان نے بدگمان ہو کر مصر پر چڑھائی کا سامان کیا تھا اور مصر کے وزیر اعظم نے پیغام بھیجا تھا کہ ایک یوسف کے لئے اتنے بڑے لشکر کی کیا ضرورت ہے۔ کسی غلام کو حکم دیجئے وہ مصر آ کر مجھے اونٹ کی تنگی پیٹھ پر باندھ کر لے جائے اور سلطان یہ پیغام سن کر تردد یا تھا اور پیار و محبت کے خطوط لکھے تھے۔ جب تک آقا زادی کا گھوڑا قلعہ کے دروازوں میں غروب نہ ہو گیا وہ کھڑا دیکھتا رہا۔ وزیر اور سردار، والی اور امیر پیشوائی کو دوڑے مگر اس نے مطلق توجہ نہ دی اور سوار ہو گیا۔ مقررین بارگاہ نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔

”اس قلعے کا تین بار محاصرہ ہوا ہے۔ پانچ ہزار جانیں اور پانچ لاکھ اشرافیاں خرچ ہوئی ہیں۔ آپ کی ذات مقدس پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ یہ قلعہ عراق کا دروازہ ہے، شام کا محافظ ہے، شیخ البیال کا گھمبان ہے۔ کھلوانا نہیں ہے جو کسی لڑکی کو کھیلنے کے لئے دے دیا جائے۔“

”سچ ہے..... فوجی اعتبار سے یہ قلعہ بہت بڑا ہے، لیکن اس تعلق کے مقابلے میں، جو سلطان مرحوم کو میری ذات سے تھا بہت چھوٹا ہے۔ اگر میں سلطان کی شفقت بھلا سکا ہوں

تو تم میری عنایات نظر انداز کر سکتے ہو اور تم سے چھوٹے تمہارے الطاف فراموش کر سکتے ہیں۔ اس طرح زینہ پزیر قوم کو بد اخلاقی کی خاموش تعلیم دی جاسکتی ہے۔

حلب سے آرمینیا کے عیسائی بادشاہ روپن کی سرکوبی کو اٹھا۔ راستے میں قلعج ارسلان کی تادیب کرتا ہوا، المصیصہ کو غارت کرتا ہوا حسن المناقر کے دروازے پر اتر پڑا۔ اسے زمین کے برابر کر کے روپن کی تباہی کے لئے تھکایا رہیں رہا تھا کہ روپن کا بھائی سفیر بن کر حاضر ہوا، بیش بہا نذرانے پیش کر کے اور ردھو کر روپن کی جاں بخشی کرائی۔ واپسی میں رودسجہ کے کنارے واسط میں دربار کیا۔ شاہان عراق، موصل، اردنیل، کیفا، ماروین، سلطان قونیہ اور شاہ آرمینیا کی نذریں قبول کیں، خلعتیں پہنائیں اور اسمن و آشتی کا خطبہ دیا۔

شام کے نائب السلطنت اور اس کے مشہور برادر زادے فرخ شاہ کی پڑا سراں موت کا پرچہ لگا۔ پھر خبر آئی کہ افرنجیوں نے دمشق کے مضافات لوٹ لئے۔ وہ غیض و غضب کے عالم میں ایک ایک کوچ میں دود و منزلیں لپیٹتا دمشق پہنچا۔ قصر کے سامنے میدان میں تین ہزار قیدی اور آٹھ سو مردھیر تھے۔ ابھی قیدیوں کی زندگی کا فیصلہ ہونا تھا کہ زندگی کی سب سے وحشت ناک خبر آئی یعنی کرک کارحینا الذمکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی طرف بڑھ رہا ہے اور اس کے منصوبے میں مقامات مقدسہ کی بے حرمتی کے علاوہ رسول اللہ کا جسم اطہر بھی (نعوذ باللہ) قبر مبارک کھود کر لے جانا ہے۔ اس خبر سے ساری دنیائے اسلام میں آگ لگ گئی، لیکن سب اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے ہاتھ ملتے رہے، ماتم کرتے رہے، صدقے دیتے رہے اور نماز خوف ادا کرتے رہے۔ اس نے قیدیوں کو جنھیں مسلمان تاجدار سنبھال کر رکھتے تھے اور آڑے وقتوں میں ڈھال کا کام لیتے تھے، سولی پر لٹکا دیا اور رحیمنا الذمہ کے تعاقب میں سوار ہوا۔ حجاز کی سرحد پر مصر کے امیر البحر لولونے حاضری کی سعادت حاصل کی اور رحیمنا الذمہ کی شکست فاش کی خبر سنائی اور اس کے ناپاک لشکر کے قیدی پیش کئے جن میں بڑے بڑے نائب شہسوار اور پادری شامل تھے۔ انہیں رکاب میں لے کر وہ کرک کا قصبہ پاک کرنے چلا۔ شہر پناہ کے نیچے خیموں کے ساتھ ساتھ سولیاں بھی کھڑی کیں اور تفصیل سے جھگٹائی ہوئی ان گنت آنکھوں کے سامنے رحیمنا الذمہ کے گرفتار لشکر کو پھانسی پر چڑھا دیا۔ کرک کے قلعے کا استحکام دور دور تک مشہور تھا جو شہر کے مغرب میں پہاڑ کی طرح کھڑا تھا اور

وہ شاد کام رخصت ہوا تو سرداروں نے اسے گھیر لیا۔
 ”ہم نے آتے ہی آتے شہر کو الٹ پلٹ کر دیا۔ دشمن سر اسید ہے۔ لشکر فتح کے نشے میں چور خندق زیر کر لی گئی ہے، دیواریں ہماری یلغار کو روک نہیں سکتیں۔ ایسی حالت میں محاصرہ اٹھالینا آئین سیاست کے خلاف ہے۔“

”ہاں، لیکن آئین سخاوت اور آئین شجاعت کے عین مطابق ہے۔ ہم اپنی قوم میں جو ایک صدی کی افرنجی تاراج سے بے اعتماد ہو چکی ہے اعتماد پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اسے یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اس کی فتوحات اتفاق پر نہیں قوت پر مبنی ہیں۔ دشمن کتنی ہی تیاریاں کر لے، ہم جب انھیں گے نیست و نابود کر دیں گے۔ یہ قلعہ ہماری شکار گاہ کا ایک چالاک شکار ہے جو اپنی مکاریوں کی بدولت زندہ ہے اور جسے زیادہ دنوں برداشت نہیں کیا جائے گا۔“

جون ۱۱۸۶ء کو پرچہ لگا کہ عیسائیوں نے پانچویں مرتبہ صلح شکنی کی اور حاجیوں کے قافلے برباد کر دیئے۔ اس نے اس خبر کو سکون سے سنا۔ مشرق پر نظر ڈالی۔ افریقہ سے آرمینیا اور یمن سے مصر تک کسی کی آستین میں کوئی چور خنجر ایسا نہ تھا جو اس کی گردن کے لئے تڑپ رہا ہو۔ عربی گھوڑوں پر بدو سواروں کو چڑھا کر حلب، موصل، ناردین، کیفا، مصر اور یمن حکم نامے بھیجے کہ ان چیدہ سواروں کو حاضر کیا جائے جن سے عربی قبیلوں اور عجمی خاندانوں کی آبرو زندہ ہے اور خود چار ہزار سواروں کے ساتھ حوران کے علاقے میں الشتر کے مقام پر وہ جھنڈا گاڑ دیا جسے بیت المقدس پر لہرانا تھا۔ ہنسل پر کمک کی فوجوں کی سلامی لی اور لشکر کا جائزہ لیا۔ بارہ ہزار سوار مشرق کے سب سے بڑے سپہ سالار کی رفاقت میں جان دینے کو تیار تھے۔ قراول نے خبر دی کہ صفوریہ کے مقام پر دو ہزار نائٹ (ان میں اسکور، بکتر بردار اور خدمت گار جو خود بھی سپاہی ہیں شامل نہیں کئے گئے) چودہ ہزار ترتر کو پول (فوج سوارہ) اور اٹھارہ ہزار پیدل جمع ہیں اور طریقہ سے آنے والے لشکر کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس نے لشکر کی سرداریاں تقسیم کیں۔ نور الدین امیر کیفا کو طایہ، جلال الدین امیر مار دین کو عقب، برادر زادے قتی الدین کو مسند اور کوکبری کو میسرہ دے کر قلب کو نفسی نفس سنبھال کر جمعہ کی نماز پڑھی اور سلام پھیر کر طبل جنگ بجوایا۔ عین الجبل کے تمام عیسائی مورچے تہس نہس کرنا خوانہ پہنچ کر قراولوں کا انتظار کیا۔ مطمئن ہو کر روادوں جو صیدا سے عبور کیا اور تاج الملوک

خود شہر ایک زبردست شہر پناہ کی حفاظت میں تھا، لیکن مصیاف اور حلب جس کے فزاک میں پڑے ہوں اسے کیا خوف دلا سکتا تھا۔ حکم دیا کہ بڑی بڑی گیارہ منتخب شہر پناہ کے ایک گوشے پر سنگ بار ہوں۔ دو پہر کے بعد خبر آئی ہے کہ فہیل نے لشکر کو سلام کر کے راستہ دے دیا۔ اس نے جاتے ہی جاتے شہر لے لیا لیکن دشمن نے بھاگتے بھاگتے چالیس گز گہری خندق کا وہ پل توڑ دیا جو قلعہ کا واحد راستہ تھا۔ سارے شہر کے ہتھیار بند گرفتار ہوئے۔ سارا شہر جو ریحینا لڈ کی شادی کی خوشی میں بھڑکیلے کپڑے پہنے، شراب میں مست و ادیش دے رہا تھا، بدحواس ہو کر قدموں پر گر پڑا اور وہ اس عظیم الشان برج کے نیچے آگیا جو خندق کے اس پار کی دیواروں کے ٹکوں پر سر اٹھائے کھڑا تھا اور اس کی گاتھک وضع کی کھڑکیوں کے دھندلے رنگین شیشے تیروں اور پتھروں کی مار سے چور چور ہو گئے تھے۔ فرمانروائے کیفا نور الدین جس نے اس لڑائی میں بڑے بڑے کام کئے تھے گھوڑا اڑاتا آیا اور اپنے رسالے کو حکم دیا کہ قیدیوں کی مدد سے شہر کے مکانات ڈھکیل کر خندق کو پاٹ دیا جائے۔ پھر گھر وندوں کی طرح پتھر کے مکان گرنے لگے اور قلعے پر دھاوے کا انتظام ہونے لگا۔ برجوں پر منتخب مہارتیر اندازوں کی طرح سنگ باری کرنے لگیں اور ان کے کنگرے، مزاریں اور حاشیے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے اور نعرہ زن فوج کے ہم سے شہر کا پنے لگا کہ ریحینا لڈ کی بیوی اور شاہ یزدنم کا بھائی چڑے کے سرخ موزے اور سرخ ریشی قبا پہنے سفید جھنڈا اڑاتا ننگے سر خالی نیام پہنے آہستہ آہستہ گھوڑے کو ڈھکیلتا آیا اور اس خندق کے اس پار کھڑا ہو گیا۔ اجازت ملے ہی اور کشتی پاتے ہی خندق اتر کر آیا اور رکاب کو بوسہ دے کر درخواست کی۔

”میں بادشاہ یزدنم کا بھائی اپنی بہن کی حرمت کے نام پر اور اسلام کی

سخاوت کے نام پر بادشاہوں کے بادشاہ سے گزارش کرتا ہوں کہ

ریحینا لڈ کی خطا معاف کر دی جائے اور اس برج کبیر کو جو جملہ عروسی

ہے پتھروں سے محفوظ کر دیا جائے۔“

اور وہ مغرب کے غلاموں کی طرح موڈب کھڑا ہوا۔

”ہم قسم کھا چکے ہیں کہ اپنی تلوار سے ریحینا لڈ کا سرا تاریں گے تاہم اسلام کے

نام پر مانگی ہوئی بھیک کی خاطر کچھ دنوں کے لئے اس کی موت ٹال دی جائے گی۔“

کو دو ہزار سوار دے کر حکم دیا کہ طریقہ سے نکلنے والے لشکر کو تباہ کر دے اور خود کفر سبت کی طرف مڑ گیا۔ دوسرے دن اطلاع آئی کہ تاج الملوک نے طریقہ کو مدد اس کے لشکر کے پھونک دیا۔ قراولوں نے گزارش کی کہ عیسائی بڑھتے آرہے ہیں۔ اس نے لشکر کو چڑھا کر حطین کی بلند سطح پر پھیلادیا جس کی پشت پر سیدی ڈھلان کے نیچے گہری جھیل تھی۔ داہنی سمت پتھر پلے بنجر علاقے اور بائیں جانب وہ تمام لبریز جھیلیں اور شاداب باغ تھے جن تک افرنجی تلوار ہلائے بغیر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس نازک مقام پر بوڑھا تجربہ کار سپاہی کوکبری اپنے سالاروں کے ساتھ حاضر ہوا اور بولا۔

”جنگ کا فیصلہ تلواریں نہیں تقدریں کرتی ہیں۔ اگر تقدیر نے یاوری نہ کی تو ہم سلطان سے کہاں ملیں گے۔“

”خوش کوثر کے کنارے۔“

بوڑھے سردار نے اپنا بھاری عمامہ اس کی رکاب پر جھکایا اور سوار ہو کر اپنے لشکر میں چلا گیا۔ پھر اس نے نوہ کی کڑیوں کی زرہ پر کفن پہنا۔ وہ طربوش سر پر رکھا جس پر فدائی کے خنجر کا داغ تھا اور اس گھوڑے پر سوار ہوا جو مشرق و مغرب کا سنگم تھا اور جس کی جست و خیز نے یورپ کی دارالگوشتوں میں صف ماتم بچھا دی تھی اور اپنے زرد جھنڈے کے نیچے کھڑے ہو کر جائزہ لیا۔ اب ہلتی ہوئی کمان کی طرح عیسائی لشکر نظر آنے لگا تھا۔ داہنے ہاتھ پر ریمینڈ والی طرابلس طبقہ آلودیہ کے سرخ پوش نائٹوں کے جلو میں آرہا تھا۔ ان کے بجلی بکتر پر سونج کی کرنیں تڑپ رہی تھیں۔ بائیں ہاتھ پر یروشلم کا سپہ سالار ہمفری ہاسٹلرز کے شہسواروں کے آگے آگے بڑھ رہا تھا اور سامنے صلیب مقدس کے سائے میں شاہ یروشلم بالڈون کے چاروں طرف نمپلرز کے مشہور شمشیر زن کنوئی ڈھالیں سینے پر اٹھائے آرہے تھے۔ ان کی پشت پر لوہے میں جکڑے ہوئے بیدل سپاہی آہنی نیزوں کو بیچ سے پکڑ کر فولادی مجسموں کی طرح رینگ رہے تھے۔ ابھی اس نے حملے کے اشارے میں اپنے خاص زرد علم کو حرکت بھی نہ دی تھی کہ نورالدین طلایہ کو عقب میں لے کر اڑا اور ریمینڈ پر گر پڑا اور اس کے قریب کھڑے شہزادے ملک الظاہر کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس نے گھوم کر ملک الظاہر کی تلوار کی سیدھ میں دیکھا کہ اس کا جواں سال اور تجربہ کار بھتیجہ قلی الدین

اپنے سواروں کو حرکت دے چکا ہے اور بائیں ہاتھ میں سفید گھوڑے کی راسیں اور داہنے ہاتھ میں تلوار علم کئے گشتان کے دامن اڑاتا عقاب کی طرح دشمن پر جا رہا ہے۔ اس نے گھوڑے کو پیچھے ڈھکیلا۔ ایک علم دار کو جو زرد علم پکڑے اپنے آقا کا منہ دیکھ رہا تھا اشارہ کیا۔ اسے جنبش ہوتے ہی بانہے گر بنے لگے اور کوکبری نے بھی اپنے لشکر کو حرکت دی۔ اب مسیحی باجوں کی ٹھنک اس کے سر پر پہنچ گئی اور جنگ مغلوبہ کا آغاز ہونے لگا۔ اس نے بھی اہلقت کو چھیڑا اور تین میل لمبی ٹیڑھی میڑھی قطار میں لڑتے ہوئے لشکر کے ایک ایک بازو ایک ایک مورچے پر پہنچا جہاں مدافعت میں شدت محسوس کی وہاں اپنے مملوکوں کے ساتھ لڑا اور دشمن کو دھکیل کر اگلے بیروں واپس ہوا اور دوسرے مرکز کی خیریت لینے چلا۔ شام تک وہ انھیں ماریا تک دھکیل لے گیا۔ باجوں کی مخصوص دھنیں بجوا کر علموں کو سیدھا کھڑا کر کے لشکر کو واپسی کا حکم دیا۔ سلامت افواج کی صفیں باندھ کر مغرب کی نماز پڑھائی اور اس وقت تک جانماز پر بیٹھا رہا جب تک عشاء کا وقت نہ آگیا۔ پھر اپنے خیمے میں اپنے سپہ سالاروں کو طلب کیا۔ غنیم کی قیام گاہ گھیر لینے کی تاکید کی اور حکم دیا کہ جب تک اجازت نہ ملے اپنے غضب کو سنبھالے رکھو اور واضح کیا کہ یہ لڑائی بیت المقدس کی لڑائی ہے جو حطین میں لڑی جارہی ہے۔ اس کی اہمیت کو سمجھو اور پوری دانائی و دلیری سے حالات کا مقابلہ کرو۔ پھر ایک ہزار اونٹ تیروں اور سات سو اونٹ ہتھیاروں سے لدے ہوئے تقسیم کئے اور خدا کی عبادت میں صبح کا انتظار کرنے لگا۔

صبح کی پہلی کرن پھوٹنے ہی اس نے خفیہ احکام کے ذریعہ ماریا کے عیسائی لشکر گاہ کے چاروں طرف کھڑی ہوئی خشک جھاڑیوں میں آگ لگوادی اور غنیم بھڑوں کی طرح چھٹوں سے نکل نکل کر صف بستہ ہو گیا اور دھوپ نکلتے نکلتے اس کے لائق سپہ سالار اپنے اپنے مقامات پر متعین ہو گئے۔ دشمن گرمی سے بے قرار ہو کر جلد سے جلد حملے کے لئے آگے بڑھنے لگا اور وہ اپنے لشکر کو سینٹا پیچھے دیتا چلا آیا یہاں تک کہ افرنجی محض ٹوٹ گئیں اور سورج کی کرنوں کے نیزے آگ برسانے لگے اور باجوں، نعروں سے زمین و آسمان دہلنے لگے۔ اب اس نے اپنے سبز جھنڈے کو حرکت دی اور اس کی کمان کے ساتھ دس ہزار کمانیں کڑکنے لگیں اور دشمن کے سیکڑوں سوار پیدل ہو گئے۔ نائٹ اور شہسوار دست بدست جنگ

کے لئے لپکنے لگے لیکن وہ انھیں تیروں کی بارہ پر رکھے رہا یہاں تک کہ کئی ہزار تیراڑتے ہوئے سانیوں کی طرح دشمن کو ڈس چکے تھے۔ تب اس نے زرد جھنڈے کو جنبش دی اور فیصلہ کن لڑائی کے لئے باجے بجوادیئے اور اپنے خاص برداروں کے ساتھ دشمن پر تن واحد کی طرح چلا اور اپنے نقشے کے مطابق تھوڑی دیر لڑ کر جب دشمن کے آہن پوش سواروں کا دباؤ پڑا تو پیچھے ہٹ گیا۔ جب غنیم کی صفیں بے ترتیب ہو چکیں تو پلٹ کر ان کو اپنے زرخے میں لے لیا اور جنگ مغلوبہ شروع ہو گئی۔ اس مقام پر ملاحظہ کیا کہ تقی الدین کا لشکر اسے اس کے محافظ سواروں کے ساتھ تین سوانٹوں، ریمینڈ کے جھنڈوں اور خاص برداروں کے حلقے میں چھوڑ کر پیچھے ہٹ رہا ہے۔ وہ انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں پہنچا اور لٹکار کر کہا:

”دشمن پر اس کا دروغ ثابت کر دو۔“ اس کی آواز سن کر اور بیلغار دیکھ کر سپاہ نے پلٹ کر حملہ کیا اور صفوں کی صفیں الٹ دیں اور نائٹوں کا حلقہ توڑ کر قلعہ الدین کے ساتھ دشمن کے قلب میں گھس گئے۔ اب اس نے اہل قلعہ کو سارے میدان کا جائزہ لیا اور حکم بھیج کر ان مملوکوں کو طلب کیا جنہوں نے آج کی لڑائی کے لئے سبز کفن پہنے تھے اور خود، بکتر اور ڈھالیں پھینک دی تھیں اور میدان سے الگ سلطان کے حکم کا انتظار کر رہے تھے۔ اب وہ سفید گھوڑوں پر سوار شانوں پر سپاہ بال اور سینے پر سپاہ داڑھی اڑاتے، دونوں ہاتھوں میں تلواریں علم کئے، گھوڑے کی راسیں کمر میں باندھے فرشتوں کی طرح نازل ہوئے۔ یہ دشلم کے سپہ سالار نے انہیں جان دے کر روکنا چاہا لیکن نہ روک سکا اور وہ اس کی رکاب میں آ کر جنگ سلطانی لڑنے لگے اور ایک ایک گردن کا ایک ایک ہزار گردن سے حساب کرنے لگے۔ پھر وہ سرخ خیمہ نظر آیا جس کے چاروں طرف صلیبی جھنڈے کے سائے میں بال دون اور ریحینا لائڈ سیٹروں آہن پوش نائٹوں کے ساتھ پروانہ دار لڑ رہے تھے۔ اس نے توران شاہ کو حکم دیا کہ اس خیمہ کی طنائیں کاٹ دو اور فتح کے باجے بجو اور اس بارگاہ کے گرتے ہی سلطانی لشکر کے تنگ گھیرے میں کھڑے ہوئے بادشاہوں، مائیلوں اور پیادوں نے ہتھیار پھینک دیئے۔ ان کی گرفتاری کا حکم دے کر خون سے لال میدان میں اپنے جھنڈے کی جانماز بنائی اور

پھر اسی میدان جنگ میں زرد دھوڑ بارگاہ نصب ہوئی۔ قالینوں کا فرش اور لکڑی

کا تخت بچھایا گیا جس پر افریقہ کے شیروں کی کھالیں پڑی تھیں اور وہ اپنے ہی خون سے لال کپڑوں میں کھجور کی چھال کے تنیے سے پشت لگا کر بیٹھا ایک سوچ بچار نائیبوں، تین سو طبقہ الداویہ، لمبیٹار، ہمپلٹرز اور مپلرز کے سواروں کے ساتھ تین تین کا سفری، کرک کار، مینائڈ اور یروٹلم کا بادشاہ بالڈون پیش کیا گیا۔ شاہ کو اپنے تخت پر بٹھایا اور پیاسا دیکھ کر حطین کے پہاڑوں کی برف سے سرد کیا ہوا پانی کا بلوریں کنوڑا عطا کیا۔ اس نے سیر ہو کر پیسا اور دوسرا کنوڑا لے کر اپنے بہنوئی ریحینا لڈ کو دے دیا۔

”شاہِ فلسطین نے پانی تم کو پلایا ہے۔“

شاہ نے سر جھکا لیا۔

دیکھنا لا! ہم نے تیرے قتل کی دو بار قسم کھائی تھی۔ ایک بار اس وقت جب تو نے عین صلح کے زمانے میں بے گناہ حاجیوں کا قتل عام کیا اور دوسری بار اس وقت جب تو نے ہمارے پیغمبر کے شہر مقدس پر چڑھائی کا ناپاک منصوبہ بنایا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم اپنی قسم پوری کرنے کے قابل ہوئے۔

نیام سے لال تموار نکلی اور اس کا سر بارگاہ کے اس سرے تک لڑھکتا چلا گیا۔ اور بالذون کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

”ہم سچائی ہیں اور بادشاہوں کے ساتھ سلوک کرنا جانتے ہیں۔ فلسطین کے بادشاہ کی تو آج سے پہلے ہمارا مشہور سپہ سالار تھی الدین بھی ایک بار جاں بخشی کر چکا ہے۔ آپ کا فدیہ وہ تمام مسلمان ہیں جو فلسطین کی حکومت میں قید ہیں۔ رہے یہ نائٹ اور سوار تو ان کے سروں پر بے گناہ مسلمانوں کا خون ہے۔ اس لئے یہ دمشق کی گلیوں میں سولی پر چڑھائے جائیں گے..... راہبوں اور شریفوں سے نرم سلوک کیا جائے گا۔“

وہ رات فتح کے نعروں کی گونج میں بسر کی اور صبح اس قوم کے سوسو سواروں کو ایک ایک قلعے کی فتح کا حکم صادر کیا جس کے سوسو سپاہی ایک ایک نائٹ کی صورت دیکھ کر بھڑوں کی طرح گردنیں ڈال دیتے تھے اور خود پانچ ہزار سواروں کے ساتھ راستے کے شہروں اور قلعوں پر اپنا پرچم اڑاتا فتح کے جلوں کی مانند گشت کرتا بیت المقدس کے دروازے پر کھڑا ہو گیا اور ”باب یافا“ کو زور کر کے لے لیا۔ اسی وقت سفارت حاضر ہوئی جسے اپنی بارگاہ میں

”پروردگار اس فتح الفتوح کے شکر کے لئے تیرے بندے کی زبان میں طاقت ہے اور نہ الفاظ میں وسعت۔ رب العالمین تو نے جن کمزور ہاتھوں پر عظیم الشان فتح بخشی ہے وہ تیرے حضور میں ممکن خاکساری کے ساتھ دراز ہیں اور دعا مانگتے ہیں کہ جو جھنڈا تیرے گھر پر اس شکوہ سے لہرا رہا ہے وہ قیامت تک لہراتا رہے، قیامت تک لہراتا رہے۔“

آمین۔ آمین۔ آمین۔

مسجد اقصیٰ کے دروازوں پر اس مقدس نعرے سے گونج گئے۔ اس نے گھوم کر دیکھا اس کے پیچھے بڑے فرمانروا، سپہ سالار، بھائی بھتیجے اور بیٹے صفیں باندھے جہدے میں پڑے تھے۔ مسجد عمر میں نماز پڑھ کر نگاہ اٹھائی تو سپہ سالار ملک العادل کھڑے تھے۔ سفید عمامے پر ایک انگلی چوڑا ہیرا لگا تھا۔ کفتان سے جھانکتی صدری میں زمرہ کے تیلے چمک رہے تھے۔ تلوار کے نیام پر ہیرے جگمگا رہے تھے۔ سلام کر کے دروازہ کھول دیے۔

”میں سلطان اعظم سے کچھ مانگنے آیا ہوں۔“

”ہم نے بغیر سنے عطا کیا۔“

”اس مقدس شہر میں رہنے والے عیسائیوں میں جنہوں نے یہاں کا متبرک دانہ کھایا ہے اور برگزیدہ پانی پیا ہے ایسے مفلس بھی ہیں جو نام نہاد زہد یہ ادا کر کے رہائی نہیں حاصل کر سکتے۔ میری آرزو ہے کہ ایسے ایک ہزار عیسائیوں کو زہد یہ ادا کر کے آزاد کر دوں اور ان کو بھی اپنی خوشی میں شریک کروں۔“

”ہم تمہاری فیاضی سے سرور ہوئے اور حکم دیتے ہیں کہ ہماری طرف سے بھی ایسے دس ہزار عیسائیوں کا زہد یہ ادا کر کے آزاد کیا جائے اور اجازت بخشتے ہیں کہ ہمارے سالاروں، بھائیوں، بھتیجوں اور بیٹوں میں سے جو بھی چاہے اس نیک کام میں شریک ہو اور اگر چہ کیے کیے ہو تو خزانے سے قرض دیا جائے۔“

وہ سفید سوئی کفتان، سفید سوئی ازار اور زرد چمڑے کے موزے پہنے گھوڑے پر سوار ان خاص برداروں کے جلوں میں ”باب یافا“ سے گزر رہا تھا جو زہد یہ کی زرد گر تیاں،

طلب کیا۔ شہر قدس کے تاجروں، شریفوں، امیروں، تاجروں اور پادریوں کے ساتھ اسقف اور بالیان نے دست بستہ گزارش کی۔

”ہم آپ کے پاس بیت المقدس پر صلح کی شرطیں لے کر حاضر ہوئے ہیں۔“

”کہیں فاتح مفتوحوں کی شرطیں سنا کرتے ہیں۔“

بالیان اسقف کو وحشت سے گھورنے لگا۔

”سنو..... بیت المقدس جتنا تمہارے لئے متبرک ہے ہمارے لئے بھی اتنا ہی

مقدس ہے۔ ہم اس بات پر قادر ہیں کہ اگر چاہیں تو اس دن کا انتقام لے لیں جب یہ برگزیدہ شہر تمہارے ناپاک قبضے میں آیا تھا اور اس کی گلیوں میں تم نے ہمارے بچوں اور عورتوں کے خون سے نہریں بہائی تھیں۔ ہم اس بات کی بھی قدرت رکھتے ہیں کہ اپنی آنکھوں کے سامنے تمہارے گرجاؤں کو غلاظت سے ناپا دیں، پھر کھدوا کر زمین کے برابر کر دیں اور تمہاری مقدس صلیبوں کی لکڑی سے اپنے غلاموں کی غذا پکوائیں، لیکن ہم ایسا نہ کریں گے۔ اس لئے کہ ہمارے دین نے دوسرے مذاہب کے مقامات مقدسہ کے احترام کی تعلیم دی ہے اور ہمیں وہ تعلیم عزیز ہے۔ تمہاری حیثیت ہمارے نزدیک مجبوروں کی ہے اور ہم جنہوں نے بڑی بڑی شہنشاہیاں غارت کر دیں مجبوروں پر تلوار اٹھانا کسر شان سمجھتے ہیں۔ حکم دیا جاتا ہے کہ بیت المقدس کے دروازے کھول دیئے جائیں۔ ساری عیسائی آبادی ہماری غلامی تسلیم کرے یا چالیس دن کے اندر زہد یہ دے کر شہر خالی کر دے ورنہ تلوار ہے۔ وہ تلوار جس کے آگے فتح چلتی ہے اور پیچھے موت۔“

اسقف نے شہر پناہ کی کنجیاں تاج الملوک کے ہاتھ میں رکھ دیں اور سپہ سالار کو حکم دیا کہ منادی کر دی جائے کہ بیت المقدس کی ایک ایک بھیڑ کے روئیں اور ایک ایک پیڑ کے پتے کو امان دی گئی اور امان کو غصب کرنے کی سزا موت ہوگی۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ سے شہر پناہ کے بڑے دروازے پر پرچم لہرایا اور نماز شکر پڑھی اور پایادہ مسجد اقصیٰ کے دروازے پر پہنچا۔ نگاہ اٹھا کر دیکھا تو افرنجیوں کے پرچم کے بجائے محمدی علم لہرا رہا تھا۔ اندرونی محراب کے ٹھنڈے منتش بازو سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور روتا رہا۔ سجدہ شکر میں گر گیا۔ آنسوؤں سے فرش بھگو دیا۔ جب ذرا دل تھما تو نرم آواز میں دعا مانگی۔

سیاہ حمل کے پا جائے، زرکار چرمی موزے اور سونے کی پینیاں پہنے طربوش پر صرّح کلفیاں لگائے، سنہری قبضوں کی تلواریں لٹکائے ان گھوڑوں پر سوار تھے جن کے زین قائم کے اور پاکھریں اٹلس کی اور برکائیں چاندی کی تھیں کہ نصرانی بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کے جم غفیر نے گھیر لیا اور خدا کے بیٹے کے نام پر آہ وزاری کرنے لگے۔ سپاہیوں نے چاہا کہ گھوڑے کو زقند لگا کر راستہ بنادیں مگر نگاہ دیکھ کر ٹھہر گئے۔ وہ دردناک کے سامنے ہی کھڑا ہو گیا۔ حلقہ تنگ ہو گیا، سپاہی دور ہو گئے اور افسر رسالہ کے حکم کی تعمیل میں مکانات پر تیر جوڑ لئے۔

”آپ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟“

”ہم آپ کی بد نصیب رعایا ہیں۔ آپ نے ہمارا زریفہ ادا کر کے آزاد کیا اور ہم آپ کے اقبال سلطنت کو دعائیں دیتے طرابلس گئے اور وہاں کے رئیس اور دنیا کے کتے نے ہمارا بچا کھچا سامان ضبط کر لیا اور ہمیں جانوروں کی طرح ہانک دیا۔ ہم بھیک مانگتے یہاں تک آئے ہیں اور آپ کی فیاضی سے دادخواہ ہیں۔“

”آپ شاہی مہمان خانے میں قیام کریں اور معیشت کی بحالی کا انتظار کریں۔“
ہزاروں آوازیں ”ناہیوں کے نائٹ“ کو درود دعائیں دیتی ادھر ادھر ہٹ گئیں۔
وہ ان کے ہجوم سے نکلا تو تقی الدین نے گھوڑے سے اتر کر التماس کیا۔

”بغداد سے امیر المومنین کے قاصد تاج اور تلوار اور ”لوا“ لے کر آئے ہیں اور مبارک باد پیش کرنا چاہتے ہیں۔“

”ان کو ٹھہراؤ۔ مناسب وقت پر باریاب کئے جائیں گے۔“

اب شاہِ فلسطین کے محل کے کنگرے نظر آنے لگے تھے اور اس کی سواری اس میدان میں داخل ہو چکی تھی جس میں سبزے کے بجائے عورتیں کھڑی تھیں۔ رنگ برنگ کی بوسیدہ قبا میں ہلگائے، سستی بد شکل صلیبیں لٹکائے، موٹی موٹی چادروں سے چہروں کو کچھ چھپائے کچھ کھولے ویران مغموں آنکھیں پھاڑے اس کے جلوں کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ چھتر بردار اور چنور ہلانے والوں کو پیچھے چھوڑ کر ان کے قریب گیا۔ کسی نے رکاب پر سر رکھ دیا، کسی نے اپنے آپ کو زمین پر ڈال دیا۔ کسی نے کھڑے کھڑے گردن جھکا لی اور کوئی رونے لگی، فریادیں اور بین کرنے لگی۔ ایک طرف سے ملک الافضل طلوع ہوئے اور گزارش کی۔

”یہ ناہیوں اور طبقات“ ”دادیہ“ اور بیطار وغیرہ کے شہ سواروں کی بیویاں، بہنیں اور بیٹیاں ہیں۔ جب ان کے شوہر، بھائی اور باپ حلیں کی لڑائی میں کام آگئے تو یہ فلسطین چلی آئی تھیں۔ اب سلطان اعظم سے فریادیں ہیں۔“
”ان کو محل میں لاؤ۔ ان کے ساتھ انصاف ہوگا۔“

قصر بالذون کے اس ایوان میں جلوس کیا جس کی آئینہ بند دیواروں کو وہ دن یاد تھا جب توے برس پہلے یروشلم کے فاتحوں نے اسی چھت کے نیچے، ان ہی دیواروں کے سائے میں بیٹھ کر بیت المقدس کے نہتے اور مجبور مسلمانوں کو زندہ پھونک دیئے، شکنجوں میں کس دیئے اور پوری آبادی کو قتل کر دینے کے مشورے کئے تھے اور ان پر عمل کے احکام صادر کئے تھے۔ بالذون کا سونے کا تخت ٹوٹ کر لشکر میں تقسیم ہو چکا تھا۔ اس کی جگہ آبنوس کا تخت بچھایا گیا تھا جس پر وہ دوازنو بیٹھا ہوا تھا کہ چاندی کا دروازہ کھلا اور اصغہانی ریشم کے پردے ہلے اور عورتیں زمین چوم چوم کر سایوں کی طرح خاموشی سے آکر کھڑی ہو گئیں۔ ان کو بیٹھنے کا حکم ہوا۔ پھر ستارہ لباس کنیزوں نے ان کے سامنے دسترخوان بچھایا اور وہ تختیں جین دیں جن کا مغرب کے بادشاہ تصور کر سکتے تھے۔ جب خالی پیٹ بھر چکے اور آنکھوں کے بھرے پیالے خالی ہو چکے تب مژدہ سنایا گیا۔

”اگر آپ کے وارث زندہ ہیں تو ان کی جانیں بخشی گئیں۔ اگر وہ ممالک محروسہ میں آباد ہونا چاہیں تو اجازت مرحمت کی گئی اور اگر وہ جلال الیوبی کا شکار ہو چکے تو روئے زمین کے جس گوشے میں آپ جانا چاہیں آپ کے شایان شان روانگی کے ساتھ پانچ برس کی کفالت کے اخراجات اور انتظامات منظور فرمائے گئے۔ اس کے علاوہ بھی کوئی خواہش ہے تو بیان کی جائے، پوری ہوگی۔“

کنیزیں قلمدان لے کر ایک ایک خاتون کے پاس گئیں اور سرگوشیوں میں اس کے وارث کا نام و نسبت پوچھ پوچھ کر لکھنے لگیں۔ حکم ہوتے ہی افسر البرید نے ہر کاروں کی جمعیت ڈیوڑھی پر حاضر کر دی اور اطلاع دی کہ ہر ممکن بخلت کے ساتھ ممالک محروسہ میں گرفتار ناہیوں اور شہسواروں کی جاں بخشی کے پروانے ارسال کئے جانے کا انتظام ہو چکا۔

پھر ”سحرا“ کے برج پر چڑھی ہوئی سونے کی صلیب اکھڑا دی۔ حرم شریف کے

احاطے میں بنے ہوئے عیسائی امراء کے مکانات ڈھائے۔ دنیائے اسلام کے شیوخ اور علماء و فضلاء کے ہاتھوں مقامات مقدسہ کی تطہیر کی رسم ادا کی اور نوے برس بعد نماز جمعہ کی ادائیگی کا اہتمام ہوا۔ محکم میں وہ شامیانہ نصب ہوا جسے شاہ آرمینیا نے اسے بطور خاص پیش کیا تھا جس کے شہتیر سونے کے تھے۔ چھت سات رنگوں کے زعفران کی تھی اور ساری دیواریں سات رنگوں کے سنبال کی تھیں اور سارا فرش سات رنگ کے قالینوں کا تھا۔ مسجد کے مرمریں حوض میں سونے کے فوارے سے معطر پانی اچھل رہا تھا اور مسلمان وضو کر رہے تھے۔ ان ہی میں سے ایک وہ بھی تھا جو سفید سوتی عمامہ باندھے، سفید سوتی کفتان اور سفید سوتی ازار پہنے کمر میں چمڑے کے کمر بند میں تلوار لٹکائے وضو کر رہا تھا۔ دنیائے اسلام کے بڑے بڑے محدث اور قاضی صف باندھے بیٹھے تھے۔ وہ بھی دوسری صف میں کھڑا ہو گیا۔ حلب کے قاضی القضاۃ جو یہاں تک پایادہ چل کر پہلا خطبہ پڑھنے آئے تھے منبر پر کھڑے ہوئے۔ وہ سیاہ بھاری عمامہ اور سیاہ چٹہ پہنے تھے جس کے حاشیوں، داموں اور گریبان پر چاندی کے تاروں کا کام تھا۔ داہنے پہلو میں حائل شریف اور بائیں طرف خجرجا تھا اور سینے پر دودھ سے سفید داڑھی جگمگا رہی تھی۔ آنکھیں خشک کیں اور فرشتوں کی سی آواز میں خطبہ شروع کیا۔

”لوگو! خوش ہو کہ یہ کھویا ہوا حیضہ جو گمراہ ہاتھوں میں تھا اور جس کی کفار ایک صدی سے بے حرمتی کر رہے تھے تمہارے پاک ہاتھوں میں آ گیا۔ خوش ہو کہ وہ گھر جس پر خدا نے اپنی رحمتوں کا شامیانہ کھڑا کیا تھا جس میں ہمارے جدا براہیم نے قیام کیا تھا اور جہاں سے ہمارے رسول آسمان پر تشریف لے گئے تھے، جو ہمارا قبلہ رہا ہے، جو رسولوں کا مسکن اور مدفن بنا ہے۔ جہاں فرشتے وحی لے کر اترے اور جہاں روز قیامت تمام بنی نوع انبان جمع ہوں گے تمہاری دعاؤں پر تمہیں بخشا گیا۔“

اگر تم خدا کے محبوب نہ ہوتے تو تمہیں یہ تخت نصیب نہ ہوتا جس میں تمہارا کوئی شریک نہیں۔ تم برکت والے ہو۔ تم جو لڑائیوں میں اصحاب بدر کی طرح، فتح و ظفر میں عمر کے مانند اور تہوہر جلال میں علی

کی مثال رہے، تم وہ ہو جنہوں نے عثمان کے لشکروں کی یاد تازہ کر دی، تم نے قادسیہ اور یرموک کی فتوحات کو زندہ کر دیا۔ اللہ تم کو اس کا اجر دے، تمہارے خون کی نذر قبول کرے۔ تم کو جنت نصیب ہو اور تم دنیا میں خوش رہو۔

اے خدائے بزرگ..... گواہی اس بندے کی سلطنت کی مدت دراز کر جو عجز و انکسار کے ساتھ تیرا احترام کرتا ہے۔ تیری نعمت کا منت گزرا ہے جو تیری مشعل روشن اور تلوار آبدار ہے۔ تیرے دین کا جانی اور اراض مقدس کا محافظ ہے۔ یعنی سلطان اعظم شہنشاہ مظفر منصور، تیرے دین کو ہیت، تیرے نام کو جلالت دینے والا، شجاعان صلیب کو مغلوب کرنے والا، اسلام اور اسلامیوں کا سلطان سلطان السلاطین، ابوالظفر یوسف الدین ابن ایوب صلاح الدین۔ اے خدائے قادر! اس کی سلطنت کو روئے زمین کے تمام ملکوں میں پھیلا دے۔ فرشتے اس کے علم و روایت کے ساتھ چلیں اور اسے پروردگار اسلام کی عظمت کے لئے اسے قائم رکھ، دین کے لئے اس کی حکومت کا محافظ بن۔ اے خدا اس کی اولاد کو اس کے بعد اپنی حفاظت میں رکھ۔ اس کے بیٹوں، بھائیوں اور بھتیجوں کی عمر دراز کر کہ اس کی قوت قائم رہے کیونکہ اس کے وسیلے سے تو نے یہ داغی اجر عطا کیا ہے اور جیسے دن گزرتے جائیں اے خدا تو اسے وہ سلطنت دے جو صالحین کے مقاموں پر ختم ہونا نہیں جاتی اور جو دعائے تجھ سے مانگتا ہے اسے قبول کر۔“

شیخ اشیرخ خطبہ دے رہے تھے اور ان کی داڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی تھی، آواز چکیوں میں گم ہو گئی تھی اور ساری مسجد میں کہرام برپا تھا۔ آسمان شق ہو گیا تھا خوشی سے آنسو بہانے کے لئے، زمین اپنے مرکز سے ہٹ گئی تھی مبارکباد دینے کے لئے، ستاروں نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی ملک کر خوش ہونے کے لئے۔ خلقت کے آنسوؤں سے اس کے

کفتان کے دامن بھیگ گئے تھے اور ان کے بوسوں سے اس کے ہاتھ زخمی ہو گئے تھے۔ سپہ سالار نے تلوار گھسیٹ لی تھی اور خاص برداروں نے..... دڑے مار مار کر ہجوم کو اس کے راستے سے ہٹایا تھا۔

اب ایک شام سامنے کھڑی تھی جس کی ہتھیلی پر دمشق کا مکمل سفید گلاب کی طرح چمک رہا تھا۔ وہ شیشے کے حوض کے کنارے اپنے نامہ بر کبوتروں کو نہاتا اور کھیلتا دیکھ رہا تھا اور پھولوں سے لدی جھانزیوں کے بیچ میں لیٹی ہوئی سنگ سرخ کی روش پر ٹہل رہا تھا کہ افسر البرید سوال بن کر کھڑا ہو گیا۔

”اجازت ہے۔“

افسر البرید آگے بڑھا۔ بارگاہ خاص کی چاروں طرف پھیلی ہوئی سنگ مرمر کی آئینہ بند عمارتوں پر طائرانہ نگاہ ڈالی۔ پاس کھڑے ہوئے ستونوں کے کان بچا کر دست بستہ معروض ہوا:

”سلطان السلاطین کے خلاف لشکر کو تکلیفیں اعتراض ہے۔ اس اعتراض میں سپاہی سے سپہ سالار تک برابر کے شریک ہیں۔“

”کیا؟“

”آپ کے بے جارح و کرم نے افرنجی سپاہیوں، شہسواروں اور نایلیوں کو صورت میں جمع ہونے کا موقع دے دیا۔ یرد شلم کا بادشاہ تمام بچی کچھی فوجوں کو استوار کر رہا ہے۔ آبادی مسلح ہو رہی ہے۔ صقلیہ کے بادشاہ کی فوجیں کمک پر آچکی ہیں۔ یورپ سے تین بادشاہوں کی کمان میں آنے والی زبردست فوجوں کا انتظار کر رہی ہیں اور یرد شلم کی بازیابی کا خواب دیکھ رہی ہیں۔ امیروں کا خیال ہے کہ اگر آپ سیاست برتتے اور عیسائیوں کے نقش قدم پر چل کر کل جتھیا ر بند آبادی کو قتل کر دیتے یا کم از کم ان کو در دراز مقامات پر نظر بند کر دیتے تو صورت کا کاغذ نکل جاتا اور تیسری صلیبی جنگ کا خطرہ ٹل جاتا۔“

”اور کچھ؟“

”بس۔“

”بادل جب برستا ہے تو یہ نہیں سوچتا کہ اس کی بوندوں سے عدن کی سیڑیوں میں

موتی جنم پائیں گے یا دمشق کے زکلی میں زہر پر دان چڑھے گا۔ وہ برستا ہے اس لئے کہ برستا اس کی فطرت ہے..... تم جاسکتے ہو۔“

وہ سوچنے لگا کہ بڑے بڑے سپہ سالاروں اور امیروں کے دل شکوک سے پاک کر دے چوبدار نے خبر دی۔

”ایک مغربی راہب باریابی کا اصرار کر رہا ہے اور بیماری کا غدر پیش کر کے کل کے انتظار سے مایوسی کا اظہار کر رہا ہے۔“

”پیش کیا جائے۔“

وہ ٹھٹھا ہوا دالان کے وسط میں بیٹھی ہوئی سنگ ساق کی چوکی پر بیٹھ گیا۔

سمور کی ٹوپی میں سفید بال اڑ سے بھیڑ کی کھال کا نیچا لبادہ پہنے ایک قد آور بوڑھا کمر جھکائے داڑھی کے نیچے صلیب لٹکائے سیاہ جریب ٹیکتا سامنے آیا۔ سفید ابروؤں کے نیچے مٹی ہوئی آنکھوں پر سفید ٹکلیں مار مار کر اسے ادب سے دیکھنے لگا۔

”کیا میں مشرق کے سب سے بڑے شہنشاہ کے حضور میں ہوں؟“

”ہاں..... تم خدا کے ایک ناچیز بندے کے سامنے ہو۔“

”میں نے مسلمانوں کی تاریخ میں پڑھا تھا کہ جب قیصر روم کا قاصد خلیفہ دوم کے سامنے پیش ہوا تو وہ مسجد نبوی کے ننگے گھن میں پیوند لگا کر تاپہنے بیٹھے تھے۔ میں سورخ کی لٹاٹی پرئس دیا تھا لیکن آج یقین آ گیا۔“

”شہنشاہ!“

”تو نے میری تین بیٹیوں کی جان اور آبرو کی حفاظت کی۔ ان کے شوہروں کو سولی کے تختے سے اتار کر انھیں بخش دیا اور یورپ کے آخری نکلے تک اپنے خرچ سے ان کے مراتب کا لحاظ فرما کر پہنچا دیا۔ اس کی شکر گزاری میں اگر میں اپنے بخیر سے اپنا سزاوار کر تیرے قدموں میں ڈال دوں تو بھی کم ہے۔“

”میں نے عہد کیا تھا کہ مشرق کے سب سے بڑے اور دنیا کے سب سے فیاض شہنشاہ کے قدموں میں سر رکھ کر اس کے احسان عظیم کا شکر ادا کر دوں گا۔ صبح کی رحمت کے صدفے میں آج میرا عہد پورا ہوا۔“

”فاتحوں کے فاتح! ہزاروں عورتیں یورپ کے اس سرے سے اس سرے تک تیری اس عظیم الشان فیاضی کے گیت گارہی ہیں جن کا تو نے یروشلم کی بازیابی کے دن اظہار کیا تھا اور جس کی ایک رت کے سامنے بڑے بڑے نائیوں کی عمر بھر کی کمائی بیچ معلوم ہوتی ہے۔“

”بادشاہوں کے بادشاہ کسی کی مجال ہے جو تیری شان کے شایان نذر پیش کر سکے تاہم ایک خبر لایا ہوں۔ شاید قابل قبول ہو۔“

”بیان کی جائے۔“

”عالم بنانا!“

”ارض قدس کی شکست نے یورپ کی بستی بستی، گاؤں گاؤں، شہر شہر اور جنگل جنگل آگ لگا دی ہے۔ آج تمام کارگر ہتھیار بنا رہے ہیں۔ بکر جنگی لباس تیار کر رہے ہیں۔ دہقان جہاد کے لئے غلہ پیدا کر رہے ہیں۔ بادشاہوں نے اپنے نجی خزانے لشکر کی آرائشی کے لئے نکال کر ڈھیر کر دیئے ہیں۔ شاعر غیرت دلانے والے گیت گارہے ہیں۔ خطیب خون میں آگ لگا دینے والی تقریریں کر رہے ہیں۔ ہر شخص نے اپنی آمدنی کا تہائی حصہ جہاد کے لئے وقف کر دیا ہے۔ عورتوں نے زیورات اتار دیئے ہیں اور بال تراش دیئے ہیں۔ بچوں نے کھلونوں کے بجائے ہتھیار خریدنے کی عادت ڈال لی ہے۔ ایک ایک گرجا میں اتنے آنسو بہائے گئے ہیں کہ اگر وہ سب جمع کر لئے جاتے تو ریگستان میں فصل پیدا کی جاسکتی تھی۔ شہنشاہ فریڈرک ستر برس کی عمر میں جہاد پر کوچ کرنے والا ہے۔ انگلستان کا بادشاہ صلیب اٹھا چکا ہے۔ فرانس کا شہنشاہ سلطنت کے پشتینی بھگڑے ختم کر کے ہتھیار باندھ رہا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ لشکر وں کا یہ سیلاب جب مشرق کے کنارے پہنچے گا تو کیا ہوگا۔ تیری فیاضیوں کا بدل کیا ہوگا۔“

”رب کعبہ کی قسم ہماری تلوار اس عظیم الشان لشکر کو خوش آمدید کہے گی۔ اتنا شاندار استقبال کرے گی کہ تاریخ کی کتابوں میں قیامت تک یاد رہے گا۔“

(”بابائے ملروم کی فریاد سنتے ہی کل مسیحی دنیا نے ہتھیار اٹھائے تھے۔“)

سلطان صلاح الدین۔ مصنفہ: شیلتھ لین پول۔ ص ۳۱۰۰

قیصر فریڈرک، شاہان انگلستان، فرانس، مصلیہ، آسٹریا، کالیو پولڈ، برگنڈی، کاڈیوک، فلانڈرز کا کاؤنٹ، صمد ہاشم اور معروف بیرن، تمام عیسائی قوموں کے ناصت، یروشلم کا عیسائی بادشاہ اور بہت سے عیسائی والیان ملک، طبقہ داور یہ اور البیطار کے بڑے بڑے شہسوار اس کوشش میں مصروف ہوئے کہ بیت المقدس پر اپنا قبضہ اور یروشلم کی مسیحی سلطنت جو تقریباً مٹ چکی ہے پھر سبز ہو جائے لیکن انجام کیا ہوا؟ قیصر فریڈرک قضا کر گئے۔ شاہان فرانس اور انگلستان اپنے اپنے ملک کو سدھارے۔ ان کے بڑے بڑے نامی، معزز اور شریف ساتھی خاک کا پیوند ہوئے لیکن یروشلم اس پر بھی صلاح الدین ہی کا رہا۔ یعنی تیسری جنگ صلیب میں تمام مسیحی دنیا کی ساری مجموعی طاقت ایک تن واحد بن کر مقابلہ کرنے آئی مگر ایک تہا صلاح الدین کی قوت کو اس سے مس نہ کر سکی۔“

وہ عکہ کی مشرقی پہاڑی پر نصب زرد خواب گاہ میں آہوں کی مسہری پر لیٹا ہوا تھا۔ یعنی ریشمی جالی کے چھردانی کے پردے اٹھے ہوئے تھے۔ سرہانے شیشے کی تپائی پر دواؤں کی مہربہ لب بوتلیں ڈھیر تھیں۔ سامنے ملک الاطباء چار چھ طبیبوں اور امیروں کے ساتھ کھڑے مرض کی سنگینی اور احتیاط کی ضرورت پر مودبانہ تقریر کر رہے تھے۔ نیچے عکہ کے شہر میں قیامت برپا تھی۔ نماز خوف کی تکبروں کی دلدوز آوازیں افرنجی باجوں اور نعروں کی صفیں توڑ کر میلوں کا سفر طے کر کے آتیں اور اس کے کانوں سے گزرتی ہوئی دل پر بخبروں کی طرح ٹوٹ پڑتیں۔ قراقوش کی کان میں میں ہزار کا مضبوط لشکر تاریخ کی سب سے بڑی مغربی افواج کے قہر محاصرے کی شدت کے سامنے بے دست دیا ہو چکا تھا۔ شاہی نامہ برکبوتر قراقوش کا خط لاکچے تھے جس کا مضمون میں ہزار سو ماؤں کے خون سے رنگین تھا۔ مصر، شام، کردستان اور قبائل عرب کے بھیجے ہوئے لشکروں کی بروقت آمد منقطع ہو چکی تھی اور وہ غیظ و غضب کے عالم میں تادیبی خطوط ارسال کرنے کے متعلق غور کر رہا تھا کہ تقی الدین

۱۔ سلطان صلاح الدین۔ از شیلتھ لین پول ۲۔ سلطان صلاح الدین۔ از شیلتھ لین پول

مسلمانوں کی فریاد باجوں کی ضربوں اور نعروں کی تکرار میں دفن ہو چکی تھی۔ فوجوں کے سامنے ان کے امیر اور سالار اپنے اپنے مرتبے کے مطابق آگے پیچھے منگوم کھڑے تھے۔ اس نے اپنے گھوڑے کو کاوا دے کر نگاہوں کے دگیر اور مودب سلام لئے اور خطاب کیا۔

”عرب کے شجاعو..... عجم کے دلیر.....“

یہ سچ ہے کہ افرنجیوں نے عکہ کی محصور فوجوں میں بیمار صلاح الدین کی موت کی خبر پھیلا دی اور بیوقوف امیروں سے من مانی شرطیں منظور کرالیں۔ یہ سچ ہے کہ تمہاری آنکھوں کے سامنے عکہ کی فصیل پر مسیحی دنیا کے متحدہ لشکر کے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ تمہارے کان بد نصیب مسلمانوں کی فریادیں سن رہے ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ تم ان کی مدد کو نہیں پہنچ سکتے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمارے سامنے جو جنگ عظیم درپیش ہے اس کے نقشے پر عکہ ایک شہر ہے، ایک مہم ہے، ایک مورچہ ہے اور سپہ سالار جانتا ہے کہ بڑی بڑی فیصلہ کن لڑائیوں کی تقدیر چھوٹے چھوٹے مورچوں کے خون سے بھی لکھی جاتی ہے۔ عکہ ایک مورچہ ہے جسے دشمن کے حوالے کر دیا گیا ہے اور اس طرح کہ میں ہزار لشکر کا صدقہ دے کر ہم نے معلوم تاریخ کی سب سے بڑی مغربی فوج کے حوصلے پست کر دیئے ہیں۔ عکہ حطین نہیں ہے جس نے بیت المقدس کے دروازے کھول دیئے تھے۔ عکہ کی شکست نے بیت المقدس کو ہم نے نزدیک اور دشمن سے دور کر دیا۔

ہم جانتے تھے کہ ہم کو بیت المقدس دو بار فتح کرنا پڑے گا۔ ایک بار مشرقی مسیحی سلطنت سے لاکر اور دوسری بار مغرب کے پانچ بادشاہوں سے جنگ عظیم کر کے۔ ایک جنگ ہو چکی، دوسری باقی ہے جو عکہ پر نہیں بیت المقدس کے دروازوں پر لڑی جائے گی۔ بیت المقدس کی گلیوں میں لڑی جائے گی۔ مسجد اقصیٰ کی محرابوں میں لڑی جائے گی۔

حاضر ہوا جس کے خود سے بکتر تک خون کی دھاریوں کی لالہ کاری تھی۔ وہ اپنے ننگے زریں ہتھیار کو کھڑکھڑاتا آیا اور مسہری کے سامنے گھٹنوں پر کھڑا ہو گیا۔ گردن جھکا کر اور اپنی کالی پلکوں پر ٹٹماتے ہوئے آنسوؤں کو سیاہ گھونگھریالی داڑھی میں بچھا کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

”عکہ..... عکہ کی خبر سناؤ۔“

وہ خاموش بیٹھا رہا اور اس کی پلکوں سے سفید خون پٹکتا رہا۔

”بیان ہو..... کہ مزید اصرار کی طاقت نہیں۔“

”جس زبان نے ہمیشہ فتح کی خوش خبری سنائی ہو اور شکست کے الفاظ سے نا آشنا ہو..... وہ۔“

”عکہ نکل گیا؟“

”سلطان السلاطین..... میں نے چاہا کہ اپنی فوج سوارہ لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑوں اور جنگ سلطانی لڑتا ہوا مارا جاؤں..... لیکن ایسے کڑے وقت میں جب کہ ہمارا ایک ایک سپاہی ایک ایک فوج کی حیثیت رکھتا ہے، اپنے دل کی خواہش پر عمل نہ کر سکا اور مجبور قاصدوں کی طرح.....“

”اٹا اللہ وانا لیراجعون۔“

”سپہ سالار عادل کو حکم دو کہ لشکر کو صف بستہ کرے..... ہم سوار ہوں گے۔“

تقی الدین اٹلے قدموں خواب گاہ سے نکل گیا۔ وہ ملک الاطباء کے بوڑھے بازو کا سہارا لے کر کھڑا ہوا۔ امراء کے ہاتھوں سے ہتھیار لگائے اور ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر ڈیوڑھی پر آیا جہاں اس کا اہلیق (گھوڑا) عکہ کی شکست پر رنجور اور خاموش کھڑا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس نے گردن پر تھیکی دی۔ ایال میں بیمار انگلیوں سے کنگھی کی اور سوار ہو گیا۔ پہاڑی کے نیچے ڈھلوان میدان میں چالیس ہزار شامی، مصری، یمنی اور ترکمانی افواج زرد و سبز اور سیاہ و سفید اور دھاری دار عبائیں اور کفتان پہنے ہتھیار سجائے، ہر جھکائے ساکت کھڑے تھے۔ گھوڑے دم ہلانا اور پاؤں پٹکنا بھول چکے تھے۔ وہ اپنے دس ہزار خاص بردازوں کے ساتھ آیا اور دائرے کی صورت کھڑے ہوئے لشکر کے قلب میں لہراتے ہوئے جھنڈے کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ سامنے عکہ کی فصیلوں کے برج پر مسیحی پرچم اڑ رہے تھے اور بد نصیب

خداے ذوالجلال کی قسم یہ جنگ اس وقت جاری رہے گی جب تک
صلاح الدین، اس کا ایک ایک بیٹا، ایک ایک بھتیجہ، ایک ایک بھائی
اور ایک ایک سوار شہید نہیں ہو جائے گا۔“

لشکر کو اپنے مقامات پر واپس بھیج کر اس نے چاہا کہ اپنے محافظ دستے کے
ساتھ دور دراز کی پہاڑیوں پر گھوم پھر کر دشمن کی قوت کا اندازہ کرے جس کے متعلق خبر تھی کہ
پانچ لاکھ سے زیادہ ہے کہ ملک الاطباء نے رکاب تھام لی۔

”گھوڑے کی سواری سے تکان ہوگی جس سے مرض کی شدت میں اضافے
کا اندیشہ ہے۔“

”مرض..... جہاد کے لئے جتھیا لگا کر سوار ہوتے ہی مرض کندھے سے اتر کر
رکاب تھام لیتا ہے۔“



ارسوف پر جھانکتی ہوئی سب سے اونچی پہاڑی کی جنوبی چوٹی کی سطح زمین پر
سلطانی مدور خیمہ نصب تھا جو شام کی برف باری کے شدید ترین موسم کی سب سے بڑی یلغار
میں پئے کی طرح کانپ رہا تھا۔ تین دن تک موسلا دھار بارش ہوئی تھی اور اس رات صبح سے
برف گر رہی تھی۔ ایک ایک خیمہ، ایک ایک درخت، ایک ایک ڈھلوان سفید ٹھنڈی روئی کے
گالے پہنے کھڑا تھا۔ وہ سمرقندی سور کی تباہی، طربوش لگائے ایلینور کی کرسی پر بیٹھا طشت
میں دہکتی آگ سے ہاتھ سینک رہا تھا۔ باہر تیز ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے جس کی بھیا تک
آواز پر ہزاروں سواروں کی جست و خیز کا دھوکہ ہو رہا تھا۔ بارگاہ کے چاروں دروازوں پر
مشعلوں اور ترکمانوں کا ہجوم تھا۔ اندر فانوس بجھ رہے تھے اور جلانے جا رہے تھے۔ دوسری
کرسی پر بیٹھے ہوئے نور الدین حکمران کیفانے عرض کیا:

”کیا سلطان اعظم عسقلان کو ڈھادیے کے فیصلے پر اٹل ہیں؟“

”آہ نور الدین..... تم نے کیا ذکر چھیڑ دیا۔ جب عسقلان کے ڈھانے کا تصور
کرتے ہیں تو کانپ اٹھتے ہیں لیکن مسیحی فوج کے لئے جنگی اعتبار سے یہ شہر اتنا مفید ہے کہ
ہم اسے زندہ نہیں دیکھ سکتے۔ ان کی ساری بحری قوت جو ہم سے کہیں مضبوط ہے اسی شہر کو

مستقر بنالے گی اور بیت المقدس تک دھاوے کرنے لگے گی۔ یعنی ہماری چڑھائیاں
مدافعت میں تبدیل ہو جائیں گی ورنہ عسقلان..... عسقلان کی ایک ایک اینٹ کی حفاظت
کے لئے ہم اپنے جیسے بیٹے کا سر دے سکتے تھے، مگر بیت المقدس کی حفاظت کے لئے عسقلان
اپنے ہاتھوں سے سہار کرنا پڑے گا۔ عسقلان کیا ہے..... بیت المقدس کی حفاظت کے لئے
دشمن اور قاہرہ تک بنیادوں سے اکھاڑ کر پھینکے جاسکتے ہیں۔“

”آپ نے رچرڈ کے نئے صلح نامے پر غور فرمایا؟“
”ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔“

”رچرڈ چاہتا ہے کہ جو کام چار لاکھ بکتر پوش نصرانیوں کی تلوار انجام نہیں دے سکی
وہ اپنی بہن کے دو سفید بازوؤں سے پورا کر لے۔ ملک العادل سے اس کی بہن کی شادی
کے معنی یہ ہوں گے کہ یروشلم کی ریاست وجود میں آئے گی جس پر عادل کے بجائے اس کی
بیوی کی حکومت ہوگی، انفرنجیوں کی حکومت ہوگی اور پھر یہ ریاست پھیلے مصر و شام کو
ہڑپ کر لے گی۔ اس منصوبے کا سب سے قاتل حصہ وہ ہے جب ملک العادل جیسا بے نظیر
سہ سالہ راہنی عیسائی بیوی کے دام میں آکر ہمارے خلاف تلوار اٹھائے گا اور مصر و شام کو خانہ
جنگی کے جہنم میں جھونک دے گا اور یروشلم کی ریاست کو ایک عظیم الشان سلطنت کے راستے
پر ڈال دے گا۔“

ایک ترکمان سردار نے اندر آ کر گزارش کی۔

”سہ سالہ ملک العادل باریابی چاہتے ہیں۔“

اس کے سر کی جنبش دیکھ کر نور الدین بارگاہ کے باہر چلا گیا۔

ملک العادل نے بیٹھنے کی اجازت پا کر سمور کی ٹوپی اتار کر تپائی پر رکھ دی جس پر
برف کے نرم ریزوں کی دھاریاں چمک رہی تھیں۔ پھر سر پر منڈھی ہوئی لوہے کی کڑیوں کی
سنبھری ٹوپی پر ہاتھ پھیرا اور ہمتن گوش ہو گئے۔

”رچرڈ سے گفتگو کے لئے تم کب سوار ہو رہے ہو؟“

”ہفتہ کا دن مقرر ہوا ہے اور آج چہار شنبہ ہے۔“

”انتظام؟“

لیکن سلطان اعظم کا مقام پوری دنیاے اسلام میں صدیوں تک خالی رہے گا اور بیت المقدس کے علاوہ قاہرہ، دمشق اور بغداد تک افریقیوں کے علم لہرا رہے ہوں گے۔“

”تمہاری دوراندیشی اور محبت سے اسی جواب کی توقع تھی، لیکن ہم فیصلہ کر چکے اور ہمارے فیصلے بدلائیں کرتے۔ جاؤ اور ہماری خفیہ روانگی کا انتظام کرو۔“



روز مقررہ پر شام کے سرمائی سورج کے طلوع ہونے کے چار گھنٹے بعد ملک العادل حاضر ہوا اور اسے دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ وہ اپنے حقیقی ایک حد تک ہم شکل اور ہم عمر بھائی کی صورت اور شبابہت پہنے کھڑا تھا۔ وہ فولادی زیر جاسے میں کشمیری چادر کا ازار اور سفید اونٹنی صدری پہنے تھا جس کے کف، گریبان اور دامن زرد تھے۔ اس پر بخارا کے سمور کا کفتان تھا جس کے نیچے مسلم یا قوت کے تھے۔ آستینوں، دامن اور شمسوں پر سونے کے تاروں کے جال میں نورتن کی جواہر دروزی تھی۔ مرصع کر بند میں ایک ڈال کے بکھراج کے قبضے کی تلوار خالص سونے کا نیام پہنے لنگ رہی تھی۔ آہنی نوپی، سفید عمامہ تھا جس کے قلب میں وہ ہیرا جگمگا رہا تھا جو یوزپ کے کئی تاجروں کے جواہرات خرید سکتا تھا۔ اس نے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر آخری بار تنقیدی نگاہ ڈالی اور ملک العادل کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

ملک العادل نے گردن جھکا کر عرض کیا۔

”آفتاب نے ایک ذرہ کا بھیس تو بنالیا لیکن یہ آنکھیں جن کے سامنے الموت کے ظالم عقابوں کی آنکھ چھپ گئی اور تیوروں کا یہ جلال جس نے بڑی بڑی حکومتوں کے کارخانے الٹ دیئے اسی طرح روشن ہیں، اسی طرح شعلہ زن ہیں۔“

”لشکر؟“

”تیار ہے۔۔۔۔۔“

”سوڈان سے کردستان تک اور یمن سے مصر تک تمام نامور قبیلوں اور خاندانوں کے ایک ہزار چشم و چراغ خاص برداروں کا لباس پہنے درگاہ سلطانی پر حاضر ہیں۔ بیس ہزار بے خطا تیر انداز ایک ہزار اونٹوں پر تیر لادے رچڑ کے خیمے کو زد میں لئے پہاڑی مورچوں پر مستعد ہیں، پچاس ہزار جانباز کفن پہنے بجلی کی تلواریں علم کئے ہوئے گھوڑے پر حکم کے

”رچڑ نے اپنے لشکر سے ایک تیر کے فاصلے پر بارگاہ نصب کی ہے۔ اسی میں اپنے خدم و حشم کے ساتھ مقیم ہے وہیں مجھ سے ملاقات کرے گا۔ شرائط کے مطابق اس کی بارگاہ میں ایک ہزار اسلحہ سوار ہوں گے۔ میرا ایک ہزار کا محافظ دستہ اس کے چاروں طرف جہاں چاہے گا کھڑا ہو جائے گا، باقی لشکر ایک تیر کے فاصلے پر مشرق میں قیام کرے گا۔“

”ماردین، کیفا اور موصل کے حکمران اپنے مخصوص رسالوں کے ساتھ ہر کاب ہوں گے، تقی الدین، تاج الملوک اور ملک الافضل یمن، دمشق اور قاہرہ کے امراء کے ساتھ دس ہزار سوار لے کر عقب میں رہیں گے اور ہمارے سر پر جلال ایوبی کا سایہ ہوگا۔“

”عادل جب رچڑ ہم سے بہ نفس نفیس گفتگو کا مشتاق ہوا تو ہم نے قبول نہ کیا اس لئے کہ وہ ہمارے برابر کا بادشاہ نہیں۔ ہاں اگر فریڈرک زندہ ہوتا تو ہم ملاقات فرماتے۔ یہی سبب تھا کہ ہم نے رچڑ کے سفیروں کو بھی باریاب نہیں کیا اور اپنے سفیر رچڑ کے پاس روانہ نہیں فرمائے۔ اس منصب سے تم کو ممتاز کیا گیا۔ یہ بھی رچڑ کا اعزاز ہے کہ نائب السلطنت اور سپہ سالار ملک العادل اس سے مساویانہ گفتگو کرے۔۔۔۔۔ لیکن ہم رچڑ سے ملنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔ اس کو دیکھنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔ اس سے باتیں کرنا چاہتے ہیں۔“

”سلطان اعظم۔“

”صلاح الدین کی حیثیت سے نہیں۔ ملک العادل کے نام سے۔۔۔۔۔ مگر اس میں تاثر ہے۔ رچڑ کے ندیموں میں کوئی ایسا نہ ہوگا جو ہماری اور تمہاری آواز کے برائے نام فرق سے واقف ہو۔“

”سرکاری گفتگو کے وقت والیان ملک میں شاہ بالذون ہو سکتا ہے لیکن مجھے یہ اندیشہ نہیں کہ وہ آپ کی آواز پہچان سکے۔ نجی گفتگو شب میں ہوگی اس لئے کہ رچڑ نے رات کے قیام کا انتظام کیا ہے اور اس وقت ترجمان کے علاوہ کوئی بھی باریاب نہیں ہو سکتا۔ لیکن مجھے ایک عذر ہے۔“

”کیا؟“

”رچڑ کیسائی چچا اور کھراہو لیکن وہ عیسائی ہے اور عیسائی بیت المقدس کے لئے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اگر غدار کی گئی تو سلطان کا ہر کاب گیر عادل کی جگہ پوری کر سکتا ہے

منتظر ہیں اور یہ غلام دس ہزار منتخب سواروں کے جلو میں بادشاہی علم اٹھائے سلطانی گھوڑے پر سوار کھڑا رہے گا جب تک اسلامیوں کا تاجدار رچڑ کے خیمے سے واپس نہیں آ جاتا۔“
 ”کتنے آدمیوں کو ہماری اس روانگی کا علم ہے جو ہمارے شایان شان نہیں۔“
 ”صرف سات سرداروں کو۔ وہ بھی اس لئے کہ اگر نصیب دشمنوں کو کوئی بداقباتی ظہور میں آئے تو ہم ایسی خوز یزرائی لڑکیوں جو تاریخ عالم میں بے مثال ہو۔“
 ”ایک التماس اور سلطان اعظم۔“

”تقی الدین اور اس کے خاص آدمیوں کے پاس کچھ کبوتر ہیں۔ وہ اس لئے ہیں کہ اگر غرداری کا شبہ ہو تو چھوڑ دیئے جائیں اور جس وقت وہ ہمارے لشکر میں آئیں اسی گھڑی ہم رچڑ کے خیمے پر جا پڑیں۔“
 ”تقی الدین اور اس کے خاص سواروں کو حکم ہے کہ وہ رات میں بھی اپنی کمرہ کھولیں اور کسے ہوئے گھوڑوں کے ساتھ آرام کریں۔“

پھر وہ برآمد ہوا۔ رکاب میں پاؤں ڈالتے ہی ہتھارے پر چوٹ پڑی۔ نیلے شیشے کے آسمان پر چمکیلے سورج کی تیزی دھوپ میں برف سے سفید پہاڑیاں جگمگا اٹھیں اور وہ ایک ہزار خاص برداروں کے حلقے میں چلا جن کی رانوں میں تڑپتے ہوئے ایک ایک سفید عربی گھوڑے کی قیمت جزیرہ انگلستان کے ایک ایک صوبے کے لگان سے زیادہ تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک سفید ادنیٰ زردوز لباس میں ملبوس تھے اور ان کی جواہر نگار زریں کمر بندوں میں جڑاؤ قبضے کی تلواریں خاص چاندی کے نیام پہنے بھول رہی تھیں۔ کسن سواروں کے بے ریش و بردت چہرے شجاعت و جلالت کی آگ سے دہک رہے تھے۔ جب وہ ارسوف کی شہر پناہ کے نیچے پہنچا تو سپہ سالار تقی الدین نے ملک العادل کے مشہور علم کو جس کے سبز پھریرے پر سنہرا شیر بنا تھا نکلان دی اور خاص بردار و قظاروں میں تقسیم ہو گئے اور چار چار گھوڑے اس کے دونوں بازوؤں پر چلنے لگے۔ باقی لشکر تاجداران کیفا اور مار دین کی کمان میں ٹھہر گیا اور پھیل کر مورچہ بندی کرنے لگا۔ باجے کا اونٹوں کا دستہ عقب میں آ گیا جن کی اپنی گردنوں میں سونے کے گھنگھر دوں کی ہمیلیں، ماتھے پر سونے کے چاند، پیروں میں چاندی کے کھنکٹے جھانجن اور بدن پر زرد اطلس کی جھولیں پڑی تھیں جن کے حاشیے پر چاندی کے گھنگھر و ننگے

تھے۔ تفصیل پر کھڑے ہوئے ہزاروں نیچے، عورتیں اور بوڑھے اس کا جلو دیکھ رہے تھے۔ اس نے نصف چہرے پر پڑی ہوئی نقاب کو برابر کر لیا۔ اب رچڑ کے سوار اپنے اونچے گھوڑوں پر جن کی پاکھریں سموس تک لمبی تھیں اس کے راستے کے دونوں طرف کھڑے تھے۔ ان کا ایک ایک رواں آہن پوش تھا۔ صرف آنکھیں خود میں لگے چشم پوش کی جالی سے جھانک رہی تھیں۔ وہ اپنے ہاتھ میں بھاری نیزے اٹھائے ہوئے بیچ سے تبر تھا،ے، بائیں ہاتھ میں لگام کی زنجیریں لئے، بائیں شانے پر نکونی ڈھال لگائے ساکت کھڑے تھے۔ وہ ان کی قظاروں سے گزرتا ہوا اس مقام تک آ گیا جہاں ایک بلندی پر فرنگی باجے بیج رہے تھے۔ اس کے سامنے دیوار کی طرح کھڑے ہوئے نانبیوں کے گھوڑے دہ بازوؤں میں تقسیم ہو گئے۔ غم کے سائے میں رچڑ کھڑا تھا۔ وہ کھجور کی طرح اونچا اور صحنی پہلوانوں کی طرح تندرست تھا۔ وہ جھکی بکتر پر زعفرانی اون کی تنگ تپا پہنے تھا جس کے دامنوں کے نیچے سرخ چڑے کے موزے تھے۔ ان میں سونے کے پھول جڑے تھے۔ کمر کی جڑاؤ بیٹی میں وہ بھاری سیدھی تلوار لٹک رہی تھی جس کا قبضہ صلیب کی شکل کا تھا۔ سینے پر مرصع صلیب تھی جس کا آخری حصہ بیٹی کو چھو رہا تھا۔ سر پر سونے کی ایک پنی سی بندھی تھی جس پر نیلم کا حاشیہ تھا۔ اس کے سفید رنگ پر نیلی آنکھیں اور سنہرے بال چمک رہے تھے۔ اب اس نے رچڑ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور دفعتاً رچڑ اپنے گھوڑے سے اتر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا سارا لشکر پیدل ہو گیا۔ اب اس نے بھی رکاب سے پاؤں نکالا۔ سونے کی زنجیروں کی لگام قراقوش کے منتظر ہاتھوں میں دے کر رچڑ کی طرف بڑھا جو اپنے دذو ہاتھ شانوں تک اٹھائے بغل گیر ہونے کے لئے آ رہا تھا۔ اسے بازوؤں میں لئے کرمسوس ہوا گویا وہ دشمن فوج کا سپہ سالار بادشاہ نہیں اس کا بیٹا افضل ہے۔ جب تک سرکاری آداب نے اجازت دی وہ رچڑ کو اپنے آغوش میں لئے رہا۔ پھر اس کا داہنا ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ میں لے کر اس بارگاہ کی طرف بڑھا جس کے سامنے کھڑا ہوا نانبیوں کا پردہ ہٹ چکا تھا اور جس کے سر پر مغرب کے پانچ بادشاہوں کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔

رچڑ نے ذرا جھک کر ترجمان کی زبان سے کہا۔

”قیصر..... فریڈرک کے جانشین..... ہونے والے شہنشاہ۔“

نائیوں کا زکار فولادی لباس پہنے خود میں ہیرے کی کٹنی لگائے ایک دراز قد
نوجوان نے عصائے شاہی کو اٹھائے ہاتھ میں منتقل کیا اور نگاہاتھ پیش کر دیا۔

”بادشاہ صقلیہ۔“

ایک کسمن بادشاہ نے جوتاج پہنے تھا اور عصائے سلطانی پکڑے تھا جھک کر ہاتھ
بڑھا دیا۔

”یروشلم کے قانونی بادشاہ بالڈون۔“

بالڈون نے جس کی دوبار جاں بخشی کی گئی تھی شرمناک مشرق کے انداز میں دونوں
ہاتھوں سے مصافحہ کیا۔

”آسٹریا کے لیوپولڈ۔“

”برگنڈی کے ڈیوک اور فرانسیسی افواج کے سپہ سالار۔“

”لی سسٹر کے ارل۔“

”چھوٹے چھوٹے والیان ملک، ڈیوک، ارل، بیرن، پادری اور ملکوں ملکوں کی
فوج کے سپہ سالار۔“

”اور آپ مشرق کی سب سے بڑی سلطنت کے نائب السلطنت عساکر اسلامی
کے سپہ سالار اعظم اور فاتح بیت المقدس کے چھوٹے بھائی۔“

قلعہ کارمحل کے سرخ ایوان میں جس کی مغربی دیوار سے لگے بہت سے سونے
چاندی کے علم کھڑے تھے، ایک چاندی کا تخت پڑا تھا اور چند سیمیں کرسیاں پڑی تھیں۔
رچرڈ نے اسے تخت پر بٹھادیا اور خود دوسرے بادشاہوں کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھ گیا۔ باقی
تمام حاضرین کھڑے رہے۔ رسی باتیں ہوتی رہیں۔ دونوں فریق ایک دوسرے کے کانٹے
ٹوٹے رہے۔ وہ رچرڈ کی ڈیگیں سنتا رہا جن پر چار لاکھ فوج کی موجودگی نے یقین کا سایہ
ڈال رکھا تھا اور رچرڈ کو دکھتا رہا جس پر ایلیئو کے ایک ایک روئیں کے مہر لگی تھی۔ وہ بوجھل
سرکاری گفتگو کو بے دلی کے ساتھ سنتا رہا۔ پھر رچرڈ اسے کھانے کے لئے اٹھالے گیا۔ کھانے
کے بعد رچرڈ اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر جنگی مجلس کی اس بارگاہ سے نکلا اور اپنی قیام گاہ
خاص کی طرف ایسے راستوں سے چلا جس پر مغرب کے کاریگر قلعہ شکن آلات تعمیر کر رہے

تھے، مرمت کر رہے تھے۔ یہیں اس نے وہ مخفی بھی دیکھی جو کٹری کی ایک سات منزلہ
عمارت کے مانند تھی اور تین طرف بھیکے ہوئے چڑے سے منڈھی ہوئی تھی۔ اسے پانچ سو
آدی اور سو گھوڑے گھیسٹے تھے۔ یہی وہ مخفی تھی جسے رچرڈ نے اپنے اہتمام میں بیت المقدس کی
فتح کے لئے بنوایا تھا اور جس نے عکہ پر پانچ پانچ من کے پتھر پھینکے تھے۔ اس کو دیکھتے ہوئے
رچرڈ نے تن کر کہا تھا۔

”اس کا نام فاتح یروشلم ہے۔“

وہ خاموش رہا اور اس ”دبا بے“ کو دیکھنے لگا جسے فرانس کا شہنشاہ اپنے ساتھ لایا
تھا اور جسے اس کے مشہور سپہ سالار الہکاری نے بڑی تدبیروں سے غارت کیا تھا اور اب جسے
نئے سرے سے تعمیر کیا جا رہا تھا۔ اس کے پیسے لوہے کے تھے لیکن ان پر لوہے کی چادریں
اس طرح چڑھی ہوئی تھیں کہ وہ آگ سے محفوظ ہو گئے تھے۔ یہ ”دبا بے“ بھی رچرڈ کی مخفی
سے لمبائی میں کچھ ہی چھوٹا تھا لیکن حجم میں اس سے کافی زیادہ تھا۔ نائیلوں کے اسکاڑ اور
اسلحہ بردار خدمت گار اپنے خیموں کے سامنے جن پر ان کے آقاؤں کے نشان اڑ رہے تھے
بیٹھے ہوئے بکتر کے فولادی آئینوں پر صقل کر رہے تھے، تلواریں پر باڑھ رکھ رہے تھے۔
نیزوں کی انی چکار رہے تھے اور گھوڑوں کے فولادی پاکھروں کی ٹوٹی ہوئی کڑیاں جوڑ رہے
تھے۔ یہ اب ٹمپلر اور ہاسٹیلرز کے ان شہسواروں کی قیام گاہیں تھیں جو رچرڈ سے وابستہ
تھے۔ ان کے دروازوں میں اونچی پردے طنابوں میں بندھے ہوئے تھے اور گھوڑے اونچی
پردوں میں لپٹے ہنہار رہے تھے۔ کہیں کہیں شہسوار اپنے ہتھیاروں کی نمائش کے نشے میں چور
مرغوں کی طرح سینے پھلائے مسکی لشکر کی قوت و شوکت کا سستا اظہار کر رہے تھے۔ پھر رچرڈ
نے اسے اپنے شکاری چیتے، باز، شکرے اور کتے دکھلائے۔ ان کے نسب اور کارنامے
بتلائے۔ یہاں تک کہ مغرب کا وقت آ گیا۔ ظہر اور عصر کی طرح رچرڈ کے خیمہ خاص میں
وزیر ابوبکر نے اذان دی اور خود اس نے نماز پڑھائی۔

رچرڈ خیمہ خاص پر خود اس کا ذاتی علم باز رہا تھا جس کے سرخ پھریرے پر ایک
شیر تاج پہنے، ایک ہاتھ میں تلوار، دوسرے میں صلیب لئے پتھیلے پیروں پر کھڑا ہوا رہا تھا۔
اس کے چاروں طرف قنات بندی کے سامنے سوار پہرے پر کھڑے تھے اور دروازوں

کے سامنے دیودار اور شاہ بلوط کے گدے جل رہے تھے جن کی روشنی میں بہت سے ملازمان خاص ادنیٰ، چرمی اور سمور کی اونچی چست قبائیں، ایک ایک پیر میں ایک ایک رنگ کے موزے پہنے، مہمیزیں لگائے، مندرے کی اونچی اور پھیلی ہوئی ٹوپوں پر عقاب کے پروں کی کلغیاں لگائے، جھوم کے کھڑے تھے۔ اندر پھیکے رنگوں اور بھدے نقوش کے پتلے قالین بچھے تھے۔ وسط میں چاندی کی اونچی بد شکل کرسیاں ایک ہشت پہل میز کے گرد پڑی تھیں۔ ان کے پاس لکڑی کے چمکیلے تختوں پر کانسی کے گول برتنوں میں انگارے دھک رہے تھے۔ مشرقی ادنیٰ دیوار کے نیچے اونچی مسہری کے پردے بندھے ہوئے تھے۔ سرہانے کانسی کی ایک الماری رکھی تھی جس پر چاندی کے عود دان میں عود سلگ رہا تھا۔ شمالی دیوار میں ایک چوڑا چکلا دروازہ تھا جس پر تیشمیں مہین پردہ پڑا تھا۔ چاروں کونوں میں آئینے اور چاندی کی برہنہ، بدایت عورتوں کے سروں پر رکھے طشتوں میں پیوست موٹی خوشبودار شمعیں جل رہی تھیں۔ اس کے علاوہ شمع دانوں کا ایک حلقہ کرسیوں کے چاروں طرف بھی کھڑا تھا جن کی لویں بھاری پردوں کے باوجود لرز رہی تھیں۔ خیمے کے جنگلے شہتروں کی ساری کھونٹیوں میں نگلی تلواریں، تگونی ڈھالیں اور نیزے لٹک رہے تھے۔ ایک غراہٹ پر اس نے چونک کر دیکھا۔ مسہری کے نیچے سے ایک غیر معمولی قد و قامت کا زرد لٹکا لٹکا اور دونوں پیروں پر کھڑا ہو کر رچرچہ سے لپٹ گیا جو اس سے بیٹھنے کی گزارش کر رہا تھا اور شریر بچوں کی طرح بہلارہا تھا اور اس کے دور تک چرے منہ پر پیار سے تھکیاں دے رہا تھا۔ اس کے بیٹھنے کے ساتھ ہی لی سٹر کا ارل اٹھ کر باہر چلا گیا۔ رچرچہ ڈھوڑی دیر لگا ہی جھکائے بیٹھا رہا پھر بولا۔

”ہمارے عزیز دوست تو ہمارے خیمہ خاص میں آرام فرمائیں گے لیکن محافظ دستے کے افسر، اسلامیوں کے مشہور سپہ سالار تقی الدین نے مہمان خانے میں جانے سے انکار کر دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنے آراستہ گھوڑوں کے ساتھ بغیر کمر کھولے آرام کریں گے۔ کیا یہ فیصلہ ہمارے عزیز دوست کی مرضی سے کیا گیا ہے؟“

”نہیں..... یہ سلطان اعظم کا حکم ہوگا۔“

”سلطان اعظم جو بادشاہوں کے بادشاہ ہیں ایک دوسرے بادشاہ کے قول پر

اعتماد کیوں نہیں کرتے؟“

”اس لئے کہ بادشاہوں نے جو آپ کے لشکر میں اپنے خدم و حشم کے ساتھ تلواریں ہلاتے ہیں سلطان اعظم کے ساتھ پیمان شکنی کی ہے۔ ہمارے خیموں میں انجیل پر ہاتھ رکھ کر کھائی ہوئی قسموں کو فراموش کر دیا ہے۔“

”مثلاً؟“

”شاہ یروٹلم..... اور صور کا ہالیان۔“

”یہ تو ایسی عیسائیوں کی بات ہوئی۔ مغرب کے سوراوڑوں نے تو کوئی ایسی نظیر نہ پیش کی ہوگی۔“

”بڑے بڑے مغربی نوابوں اور نائیبوں نے جن کی جانیں ان کی بیویوں اور بہنوں کی سفارش پر ہمارے سلطان اعظم نے بخش دی تھیں، ان ہی بادشاہوں کے لشکر میں شامل ہو کر عیسائی افواج کی قوت بڑھائی ہے۔“

”ہو سکتا ہے کہ اس بیان میں صداقت ہو لیکن اس کا بھی امکان ہے کہ عہد کی شکست کے بعد سلطان اعظم زیادہ محتاط رہنے لگے ہوں گے۔“

”ہمارے عزیز دوست کے ندیم اور سفیر جس دھوم دھام سے عہد کی فتح کا ذکر کرتے ہیں وہ ان کو زیب دیتا ہے لیکن ہمارے میزبان کی شاہی زبان سے کچھ اچھا نہیں لگتا۔“

”کیوں؟“

”ہمارے میزبان بادشاہ نے پانچ ملکوں کی پانچ لاکھ فوج اور سارے یورپ کے بحری بیڑے کی مدد سے ایک عہد فتح کر لیا ہے۔ عہد جس میں ہماری بیس ہزار محصور فوج لڑ رہی تھی اس کو اس طرح فتح کیا گیا کہ ہزاروں جانیں تلف کر لیں، بڑے بڑے نواب، نائٹ اور امیر کھو دیئے جب کہ ہمارا کوئی قابل ذکر آدمی ضائع نہیں ہوا۔ یہی نہیں بلکہ آپ کو عہد اس وقت مل سکا جب ہمارے سلطان اعظم کی موت کی جھوٹی خبر محصورین میں پھیلا دی گئی اور انھوں نے بدحواسی میں ہمت چھوڑ دی۔ معزز بادشاہ! عہد تو ایک منور چہ تھا جسے آپ نے لے لیا۔ اصل لڑائی تو ابھی شروع نہیں ہوئی۔ لڑائی تو بیت المقدس کے دروازوں پر لڑی جائے گی اور اس طرح لڑائی میں شریک ہونے والی افواج کی طلبی کے فرمان تک نہیں لکھے گئے۔ ابھی تو ہم.....“

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ عزیز دوست کہ ہم اپنی خون آلود کمواریں نیام کر لیں۔ ایک دوسرے کے ہاتھ میں دوستی کا ہاتھ دے کر کوئی ایسی تجویز ڈھونڈ نکالیں جو ہمارے عظیم مذاہب اور سلطنتوں میں ہمیشہ کے لیے امن و آشتی کی صورت پیدا کر دے۔ ہمارے درمیان کھڑی ہوئی دیوارِ زہادے، صدیوں کی بھڑکتی ہوئی آگ بجھا دے، آنے والی صدیاں آنے والی نسلوں کے خون سے محفوظ ہو جائیں۔“

”اسی تجویز کو ڈھونڈ نکالنے کے لئے تو ہم انگلستان کے بادشاہ کے خیمے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔“

شمالی دیوار کے ریشمیں پر دے پر ایک نسوانی سایہ ابھرا جو رچے کی پشت پر اور اس کی آنکھوں کے سامنے تھا جسے ترجمان کنکھیوں سے بھی دیکھنے کی جسارت نہیں کر رہے تھے۔ رچرڈ نے بارگاہ کے وسط میں جھولتے ہوئے فانوس سے نگاہ ہٹائی اور اپنی دونوں نیلی آنکھیں اس کی گود میں ڈال دیں۔

”ہم نہیں جانتے کہ ہماری شرطیں کر ہمارے عزیز دوست کا جلیل المرتبت بھائی کیا کہے گا، کیا سوچے گا۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ ہمارے جھنڈے کے نیچے کھڑی لاکھوں کمواریں اسے کس طرح انگیز کریں گی لیکن پھر بھی ہم اپنا دل اپنے دوست، اپنے بھائی کے سامنے نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ شرق و مغرب میں داکئی دوستی کی بچی بنیادیں قائم ہو جائیں اور خون کی ندیاں سوکھ جائیں۔“

”ہم ہمدرد گوش ہیں۔“

”آپ صقلیہ کے مرحوم بادشاہ کو جانتے ہوں گے۔“

”ہاں وہ ہمارے حلیف تھے۔“

”ان کی بیوہ ہماری بہن ہے۔“

”ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس کے رشتے سے ہمارے قریب ہو جائیں۔ ہمارے عزیز ہو جائیں۔“

”میں..... یعنی ملک العادل یا.....“

”ہاں آپ..... سیف الدین ملک العادل نائب السلطنت سپہ سالار اعظم۔“

”ہم اپنی بہن چین کے جہیز میں صور اور عکدے دے ڈالیں گے۔ آپ سلطان اعظم سے بیت المقدس اور اس کے مضافات مانگ لیں۔ اس طرح جو سلطنت وجود میں آئے گی اس پر آپ بادشاہت کریں گے۔ یروشلیم پر دونوں مذاہب کا قبضہ رہے گا۔ مسلمانوں کے تحت ان کے مقامات مقدسہ ہوں گے اور عیسائیوں کے عمل میں ان کے عبادت خانے ہوں گے اور فلسطین شرق و مغرب کا سنگم قرار پائے گا۔ آپ کی پشت یعنی صقلیہ پر آپ کے بیٹے کی حکومت ہوگی جس کی کمواریں آپ کی حفاظت کریں گی اور شرق میں آپ کا عظیم الشان بھائی ہوگا۔ دنیا کی کوئی طاقت آپ کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکے گی۔“

رچرڈ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھیں جھک گئیں۔ دونوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔

”اگر آپ کو ذاتی طور پر یہ بات پسند ہو تو ہم سرکاری طور پر یہ گفتگو چھیڑ دیں۔ اگر آپ سلطان اعظم کو رضامند کر لیں تو ہم یورپ کو ہموار کر لیں۔“

اس نے دیر کے بعد جواب دیا۔

”سلطان اعظم سے مشورہ کئے بغیر فیصلہ کن جواب نہیں دیا جاسکتا۔“

”ہماری ملاقات کو چند گھنٹے ہوئے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہم ایک دوسرے کو مدت سے جانتے ہیں۔ ایک زمانے سے چاہتے ہیں۔ آپ کی شخصیت میں ایسی نرمی، نیکی اور خلوص ہے کہ ہم نے بے تکان وہ بات کہہ دی جسے یورپ کے بادشاہ اپنی زبان پر تولانے کا کیا ذکر اپنے کانوں سے سنتے ہوئے بھی جھجکتے ہیں۔ ہم ایک اور زادی سے بھی اس مسئلے پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ ہمارے علم میں ہے کہ سلطان اعظم کی تمام فتوحات پر آپ کی، صرف آپ کی کموار کا سایہ رہا ہے تاہم آپ صرف ایک نائب السلطنت ہیں۔ کتنی ہی بڑی سلطنت نائب السلطنت ہو لیکن وہ..... نائب السلطنت ہوتا ہے۔ کسی ہی چھوٹی سلطنت کا بادشاہ ہو لیکن وہ بادشاہ ہوتا ہے۔ ہم کو یقین ہے کہ آپ کے سلطان اعظم کی وفات کے بعد ان ہی کا کوئی بیٹا تخت پر بیٹھے گا اور اس کا امکان ہے کہ شرق کی درباری سازشوں کے چکر میں آپ اس جلیل القدر منصب سے بھی ہاتھ ڈھولیں۔ اس لئے دور اندیشی کا بھی یہی تقاضا ہے کہ آپ یورپ کی اس عظیم الشان فوج کی موجودگی میں فلسطین کا تاج پہن لیں اور زمام حکومت سنبھال لیں۔ ہم یہاں تک کہہ دینے میں کوئی باک نہیں سمجھتے کہ

اگر سلطان اعظم اس پر رضامند نہ ہوں تو آپ اپنے خاص لشکر کی طاقت پر ان کا ساتھ چھوڑ دیں۔ ہمارے قول پر ایک بچے بادشاہ ابن بادشاہ کے قول پر بھروسہ کر کے بنفس نفیس صلح نامے پر دستخط کر دیں۔ باقی سب کچھ آپ کی اور ہماری فوجیں طے کر دیں گی۔

”میرے دوست اور میرے بھائی کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ملک العادل سلطان اعظم کے صد ہا خادموں میں سے ایک ادنیٰ خادم ہے۔ ملک العادل کا سارا جاہ و جلال سلطان اعظم کے مراحم خسروانہ کا محتاج ہے۔ جس وقت سلطان اعظم نے نگاہ پھیری اس وقت سارا زمانہ ملک العادل کے خلاف ہو جائے گا اور اس میں شک ہے کہ مغرب کا یہ عظیم الشان لشکر ملک العادل کے لئے ایک گاؤں بھی بحال کرا سکے گا۔ ہمارا سلطان ایک آفتاب ہے جس کے عطا کئے ہوئے نور نے بہت سے ذروں کو چاند ستاروں کی خلعتیں پہنا دیں۔ اگر یہ سورج اپنی کرنیں سمیٹ کر رکھ لے تو تمام چاند ستارے بے نور ہو کر رہ جائیں گے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ سلطان اعظم اس مشورے پر ہمدردی کے ساتھ غور فرمائیں گے اور توقع ہے کہ شرط کو تسلیم فرمائیں گے۔“

پھر اس نے مالی بجائی اور غیر مسلح خدمت گار آ کر کھڑے ہو گئے اور حکم کی تعمیل میں بارگاہ کی شمالی دیوار کے دروازے پر غروب ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد رچڑا اس کے ساتھ اٹھا اور دروازے سے ہوتا ہوا خیے کو پار کر کے مدور خراگہ میں داخل ہو گیا جہاں نیچی مستطیل میز پر سونے کے برتنوں میں بھنے ہوئے مسلم پرندے، تلی ہوئی پوری دانیں، شوربا، بسکٹ، پھل، میوے، پیڑ اور شہد ڈھیر تھا اور کئی گلفام دستار لباس کنیریں مودب کھڑی تھیں۔ رچڑا نے اس کے مقابل بیٹھ کر کھانا شروع کرنے کا اشارہ کر کے کہا۔

”اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے ہمارے معزز دوست کا مذہب قبول نہ کرے۔“

”ہے۔“

”کیا؟“

رچڑا نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں۔

”سونے کے برتن۔“

”آپ سونا استعمال نہیں کرتے۔“

”کرتے ہیں مگر برتن نہیں۔ ہم سونے کی کرسیاں، سونے کی میزیں، سونے کے

پلنگ وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔“

پھر کنیروں نے تمام کھانا شیشے کے برتنوں میں جن دیا۔ رچڑا نے ایک کنیر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”یہ ہماری بہن جین کی خاص الخاص کنیر ہے۔“

اس کی عمر پختہ رنگ سفید، آنکھیں نیلی اور بٹا کے شانوں پر لہرائے ہوئے بال سرخ تھے۔ وہ اسے دیکھتا رہا جو ایلینو کی تصویر بنی کھڑی تھی اور اس کی شاہانہ نگاہیں فرش پر لوٹ رہی تھیں۔ جب کنیر نے نگاہ اٹھائی تو اسے اپنا آگینے دل نگاہ کی مستی سے پگھلتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کا لباس دوسری کنیروں سے قیمتی اور بھاری تھا اور دوسری کنیروں کے برعکس اس کے بدن پر کوئی زیور نہ تھا سوائے ایک صلیب کے جو رچڑا کے سر کی ٹہنی کے جواہرت سے کہیں مہنگی تھی۔ وہ ایک مہمان نواز ملکہ کی طرح انتہائی وقار اور تمکنت کے ساتھ میز کی چھوٹی چھوٹی خدمتیں انجام دے رہی تھی اور کنیروں کی نگاہیں اس کے چہرے تک پہنچتے پہنچتے مودب ہو جاتی تھیں۔ اسے خود بخود یقین ہو گیا کہ جس طرح ملک العادل کے بھیس میں وہ بیٹھا ہوا ہے اسی طرح ایک کنیر کے روپ میں خود ایلینو کی بیٹی رچڑا کی بہن اور صقلیہ کی سابق ملکہ کھڑی ہوئی ہے۔ اس نے جین کو اتنی تیز نگاہ سے دیکھا کہ ان کو ترشتی ہوئی اس کے ہاتھ کی زریں چھری کا پینے لگی اور اس کے دل میں عجیب و غریب تہمتا تڑپ اٹھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اپنی بیٹی عفت زمانی کی طرح اسے اپنے قریب لائے، اس کی پیشانی پر بوسہ دے، اس سے باتیں کرے اور تخت و تاج کی دولت سے نہال کر دے۔ جین جو اس کے خوابوں کے تحت پر ملکہ کی طرح بیٹھی ہوئی ایلینو کی ہم شکل، ہم صورت تھی نگاہوں میں وہی تمکنت، سراپے پر وہی شاہانہ پن اور اداؤں میں وہی تاج پوش بے نیازی۔ وہ اسے رچڑا کی نگاہوں سے بے نیاز دیکھتا رہا اور جین کے چہرے کی کیفیت اسے یقین دلاتی رہی کہ وہ اس کی مودب نگاہوں کی بادوب گستاخیوں سے آشنا ہے۔ رچڑا کی آواز نے اس کی محویت کے طلسم کو شکست کر دیا۔

”ہماری آرزو تھی کہ آپ کے سلطان اعظم کو دیکھیں۔ اس سپاہی سے ملاقات کریں جس نے ایک لڑائی لڑ کر پوری مسیحی سلطنت کو غارت کر دیا، جس کی ایک فتح نے ساری مسیحی دنیا میں زلزلہ ڈال دیا، اس عظیم انسان سے گفتگو کریں جس کی فیاضی نے افسانوی شہرت حاصل کر لی ہے اور جسے تبیین کے ہمطری نے نائٹوں کے نائٹ کا خطاب دیا ہے۔“

رچرڈ یہ سب بڑی دل سوزی سے کہہ رہا تھا اور جین بڑے شوق سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی جو بظاہر رچرڈ کی طرف متوجہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اور رچرڈ دونوں سلطان سے بہت اچھی طرح واقف ہیں، مدتوں سے اس کی باتیں سن رہے ہیں، اسے دیکھنے کا ارمان کر رہے ہیں۔

”یہ سلطان کو دیکھنے کی آرزو تھی کہ ہم نے سیاست کے واسطے سے ملاقات کی خواہش کی تھی اور ملاقات میں ادب و آداب برتنے کی کوئی شرط نہیں رکھی تھی۔ سلطان اعظم نے ہمارے علاج کے لئے حکیم روانہ کئے، ٹھنڈا پانی، برف اور پھل ارسال کئے، جمائے قبول کئے اور بھیجے، لیکن ہم کو باریاب کرنا قبول نہ کیا۔ انتہا ہے کہ شہنشاہ فرانس بے بھی ملنا پسند نہ کیا حالانکہ دوسری صلیبی جنگ میں اس وقت کے شہنشاہ لوئی سے ان کی ملاقات ہو چکی تھی جب وہ صرف دمشق کے گورنر کے بیٹے تھے۔“

”اب وہ مشرق کے سب سے بڑے شہنشاہ ہیں۔“

جین نے پہلی بار اپنی آواز سنائی جس میں لیلیئور کی شعلہ خوی اور عفت زمانی کی صدا کی کھنک تھی۔

”لوئی ہفتم نے ان کو نائٹ بھی بنایا تھا۔“

رچرڈ نے لقمہ دیا۔

”ہمارے بادشاہ کی ماں اور اس وقت کی ملکہ فرانس نے انھیں اپنی خدمت میں باریاب بھی کیا تھا۔“

جین نے بڑے جوش سے کہا۔

”ہاں جب وہ ملکہ انگلستان بنیں اور اپنے ذاتی ملک ”ایسٹیک“ پر پورا حق مانگا تو

لوئی کے درباریوں نے اسی ملاقات کے افسانے گڑھ لئے۔“

یہ کہتے وقت رچرڈ کی آنکھیں جھک گئیں۔ کھانا ختم ہوا، باتیں چلتی رہیں اور وقت اس کا فرمان لے جانے والے صبارتار قاصدوں کی طرح اڑتا رہا۔ پھر اس کو رچرڈ کی خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ جس کی آرائش بادشاہوں کے شایان شان تھی۔ اس کو اندر پہنچا کر رچرڈ واپسی کی اجازت اور ٹیٹھے خوابوں کی دعا کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ جین دوسری کینزروں کے ساتھ اندر آئی۔ آنسوئی تپائی پر رکھے چاندی کے صندوقچے کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

”شب خوابی کا لباس نکال دیا جائے۔“

وہ بوڑھے ترجمان کی وحشت زدہ آنکھوں کے سامنے زرہ کی کڑیاں کھولنے میں اس کی مدد کرنے لگی۔ آہن پوش بدن پر بھی اس کی انگلیوں کے نرم زندہ لمس نے تسکین عطا کی۔ وہ تسکین جو صرف بیٹی اپنے باپ کی گردن میں باہیں ڈال کر دے سکتی ہے۔ جب وہ کپڑے تبدیل کر چکا تو وہ پھر اس مغرور بے تکلفی کے ساتھ اندر آگئی اور اسے وضو کرانے میں اپنے ہاتھ سے مدد کرنے لگی۔ عفت زمانی کی طرح ایک حکم کی تعمیل اور دوسرے حکم کا انتظار کرنے لگی۔ جب وہ فرش کے قالین پر مصری جانماز بچھا کر کھڑا ہوا تو وہ لپک کر باہر گئی اور مغربی دیوار کے پیچھے کھڑے ہوئے تاج انگلستان کے محافظان خاص کو نفس نفیس حکم دے کر ہٹا دیا۔ جب تک وہ نماز پڑھتا رہا جین دوسری کینزروں کے ساتھ مودب کھڑی رہی۔ اسے مسہری پر لٹا کر پردے برابر کئے اور ہر سکون نیند کی دعا کر کے باہر چلی گئی۔

وہ لیٹا ہوا اس رچرڈ کے متعلق سوچتا رہا جس نے عکے کے چار ہزار بے گناہ مسلمانوں کو ذبح کر ڈالا تھا اور آج کس قدر مہذب، مہمان نواز، نیک دوست نظر آ رہا تھا اور اس نے اپنے عسکری منصوبوں کی دورانہ لشی کی دادی۔ اس نوجوان سپہ سالار کو عکے کی فتح کتنی مہنگی پڑے گی۔ چاہتا ہے کہ اس فتح کو صحیح سلامت انگلستان پہنچا دے۔ کسی نہ کسی طرح بیت المقدس پر دخل چاہتا ہے۔ بہن کی زندگی برباد ہو جائے مگر اس کی سالاری کا بھرم قائم رہے۔ شہرت اور عزت کی بھوک کتنی بھیا نک ہوتی ہے۔ اور جین؟ جین کو اگر ملک العادل دیکھ لے تو اس کا امکان ہے کہ صلیبیوں کے خلاف اس کی تلوار کی گرفت ڈھیلی ہو جائے۔

وہ رات کتنی پر اسرار تھی۔ دنیا صلاح الدین کو ملک العادل سمجھ رہی تھی اور لیلیئور کی بیٹی اسے اپنا ہونے والا شوہر خیال کر رہی تھی اور ملک العادل گھوڑے پر سوار بر فیلے

نہیں، بجا اس نے ہاتھ نہ چھوڑا۔ رکاب میں پاؤں رکھتے ہی نثار سے پرچوٹ پڑی اور جھنڈوں کے بھاری پھریروں نے اسے چھپا لیا۔ جب تک اس کے خدیم و ختم نظر آتے رہے۔ رچرڈ اسی جگہ اسی طرح ساکت کھڑا رہا اور وہ اپنے دل پر ایک بوجھ لئے اپنے لشکرگاہ میں داخل ہوا۔ ملک العادل نے کسی بے داغ وفاداری اور بے لوث محبت سے اسے گھوڑے سے اتارا و رکتی دقت سے نماز شکر ادا کی۔

پھر پرچہ لگا۔

عیسائی لشکر یا فوج جانے والی سرک پر حرکت کرنے والا ہے لیکن ہمارے مسلسل حملوں سے عاجز ہے۔ رسد ختم ہو رہی ہے، سپاہیوں کی مردہ گھوڑوں پر گزران ہو رہی ہے۔ عتکہ سے یہاں تک ہمارا سرک پر بحری لٹیرے کی حفاظت کے باوجود ان کی رفتار ایک دن میں دو تین میل سے آگے نہ بڑھ سکی۔ ان کے داہنے ہاتھ پر سمندر کے کنارے کنارے رسد چل رہی ہے جس پر ان کا بحری بیڑہ سایہ کئے ہوئے ہے۔ آج خبر ملی ہے کہ رچرڈ اپنی فوج کے بائیں ہاتھ کی پہاڑیوں پر ساتھ ساتھ چلتے ہوئے، مسلسل نقصان پہنچاتے ہوئے اسلامی لشکر پر اچانک اور زوردار حملہ کرے گا۔ اس کی فوج میں لڑنے والوں کی تعداد ایک لاکھ ہے جو سب کی سب زہرہ پوش ہے۔ دوسرے کاموں کے لئے پچاس ہزار پیدل ہیں جو ہلکے ہتھیاروں اور تیرکمانوں سے مسلح ہیں اور ان کی خاصی بڑی تعداد بکتر بند ہے۔ کل فوج پانچ رچھٹوں میں تقسیم ہے۔ ہر رچھٹ میں بہادر اور تجربہ کار لڑنے والے ہیں۔ یہ وہ شہسوار ہیں جن کے برابر کالڑنے والا ساری مسیحی دنیا میں نہ ملے گا۔ پہلی رچھٹ میں طبقہ الدادیہ کے سوار ہیں جن پر بادشاہ گائی حاکم ہے۔ دوسری میں برٹنی کی فوج سوارہ جس پر لی سٹر کارل افسر ہے۔ تیسری میں فرانسیسی فوج ہے جس کے سالار آرٹور اور برگنڈی ڈیوک ہیں۔ چوتھی رچھٹ نارمن، آسٹریں، انگریز شاہزادوں، نوابوں، نائیکوں اور امیروں پر مشتمل ہیں۔ شاہی علم ان کے ساتھ ہی چل رہا ہے۔ سب سے آخری میں طبقہ البیطار کے سوار ہیں جن پر کمپا گنی کا کاؤنٹ ہنری اپنے علم کی حفاظت کئے ہوئے ہے۔ ان ہی کے ساتھ دس ہزار تیر انداز کندے دار کمانوں سے لیس چلے آ رہے ہیں۔“

اس نے خدا کو اشارہ کیا۔

جھکڑوں کے چھینڑے کھار ہاتھا۔

جب اس کی آنکھ کھلی اور اس نے کلمہ پڑھا اور پہرے پر کھڑے ہوئے محافظوں کی موڈب سرگوشیاں گنگنانے لگی تو سب سے پہلے جین داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے کنیریں گرم پانی، چاندی کا تسلیہ اور ریشمیں تولیہ سنبھالے ہوئے آئیں۔ جب وہ نماز پڑھ چکا تو جین نے اسے زہرہ بکتر پہننے میں مدد دی، بستر پر لیٹی ہوئی نگلی نکوا کو احترام سے اٹھا کر نیام میں رکھا اور تکیے کے نیچے سے خنجر نکال کر غلاف کیا اور اس کی کمر بند میں لگایا۔ کفتان کے یا قوتی تکیے اپنے ہاتھ سے بند کئے۔ کانسی کی تپائی پر رکھا ہوا عمامہ دونوں ہاتھوں میں اس ادب سے اٹھایا گویا وہ عمامہ نہیں کوئی صیغہ ہو۔ پھر دروازے پر کھڑی ہوئی رچرڈ کے آنے کی خبر دی۔ رچرڈ نے بڑی گرجوٹی سے بایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر داہنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ رچی گفتگو کی اور دوسرے خیمے میں ناشتے پر بٹھا دیا۔ جین اس کی خدمت پر مامور رہی۔

”سلطان اعظم ہمارے عزیز دوست کو محبوب رکھتے ہیں۔“

”کیوں؟“

”مطلع کیا گیا“

”مطلع کیا گیا؟“

”مطلع کیا گیا ہے کہ سارا اسلامی لشکر تمام رات کمر بستہ رہا۔ سلطان اعظم بنفس نفیس گھوڑے پر سوار ہو کر گشت کو نکلے ہیں۔ ساری رات ان کی بارگاہ پر نوبت بجاتی رہی یعنی ساری رات وہ اپنے ندیموں کے ساتھ بیدار رہے ہیں نتیجے میں ہماری فوج بھی ساری رات تیار رہی۔“

جب وہ جنگی مجلس کی خگاہ کی طرف جانے کے لئے اٹھا تو جین نے اسے آخری بار دیکھا اور محسوس ہوا جیسے وہ دمشق کے اندرونی دالان میں کھڑا عفت زمانی اور عصمت الدین کے الوداعی سلام قبول کر رہا ہو۔ جب وہ جنگی مجلس سے بادشاہوں، شہزادوں، نوابوں، امیروں، سپہ سالاروں اور پادریوں سے رخصت کی رسم ادا کر کے رچرڈ کے ساتھ چلا اور عیسائی لشکر کی سلامی لے کر اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا اور مار دین کے حکمراں نے رکاب تمام لی تو رچرڈ نے بڑے جوش و خروش سے ہاتھ ملایا اور دیر تک دبائے رکھا۔ جب تک کوچ کا نظارہ

اثبات کی تکرار سے جبل لبنان کے سلسلے کانپ اٹھے۔

”ملک العادل“

”دین پناہ!“

”میں ہزار فوج سوار کے ساتھ افرنجی لشکر کی کسر پڑوٹ پر دو۔“

”تقی الدین!“

”عالی جاہا!“

”دس ہزار سواروں کے ساتھ دشمن کے سر پر گرد اور شدید صدمہ پہنچا کر واپس آ جاؤ۔“

”دس ہزار محافظان خاص ہمارے پہلو میں چلیں اور باقی لشکر و ایوان کیفاد مار دین،

حلب و موصل تقسیم کر کے پایہ رکاب ہوں اور دوسرے حکم کا انتظار کریں۔“

وہ اپنا گھوڑا پھیر کر پیچھے کھڑے خاص برداروں کے جھنڈے کے نیچے کھڑا ہو گیا اور

سہ سالہ لشکر کی تقسیم کرنے لگے۔ پھر اس نے دیکھا کہ ملک العادل اپنے سواروں کے ساتھ

پہاڑوں کے نشیب میں داخل ہو گیا اور تقی الدین بیت المقدس جانے والی سڑک پر چکر کاٹ

کر دشمن کے سامنے پہنچ گیا۔ اب وہ اپنے خاص برداروں کے ساتھ ملک العادل کے رہنے

ہاتھ پر آ گیا جس کے بائیں پہلو پر تقی الدین چل رہا تھا۔ شاہ بلوط کے جنگلوں میں عیسائی

لشکر نظر آنے لگا تھا جواب بجائے ریگتے کے کھڑا ہو گیا تھا اور نائب دائیں بائیں چکراتے

پھر رہے تھے اور ان کے سوار آہنی پاکھروں سے ڈھکے ہوئے گھوڑوں کو بھڑا کر فولادی دیوار

کی طرح قائم ہو گئے تھے اور ملک العادل کا لشکر خارزار گرزوں اور تیغوں کو تو لے ہوئے

لیک رہا تھا جن کی کفالتوں سے ڈھکے ہوئے شانوں پر گول ڈھالوں کے پھول چمک رہے

تھے۔ پھر نعرہ کی تکرار ہوئی۔ تقی الدین دشمن پر جا گرا تھا۔ اب ملک العادل نے اپنے

سواروں کو دشمن پر لپکا دیا۔ اس کے مملوک رانوں سے نکلے جانے والے رہواروں کو سنبھالے

حکم کا انتظار کر رہے تھے۔ اب اس نے اہل کو ایڑ بتائی اور گردش ایام کی طرح دشمن کی

صفوں پر چلا۔ جاتے ہی جاتے جنگ مغلوبہ شروع کر دی۔ مسلمانوں کے بھاری گرز افرنجیوں

کے بکتر پوش جسموں پر جھانچیں بجا رہے تھے۔ ان کی تلواریں بھاری زہروں پر گرمیں، لوہے

سے لوہا ٹکراتا اور چنگاریاں اڑتیں اور زیادہ سے زیادہ سواروں کو پیدل کر دیتیں یا خفیف

سالاروں کو معد فوج کے تیاری کا حکم دیا اور خود ہتھیار بستے لگا۔ اپنے محبوب

پھنکارتے ہوئے اہل حق پر سوار ہو کر منتظر فوج کے قلب پر چڑھ گیا۔

آفتاب بلند ہو چکا تھا اور ٹھنڈی ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ عباؤں اور کفتانوں

کے دامن میں تلوں کی طرح لہر رہے تھے۔ گھوڑے ہنہنارہے تھے۔ نیم دائرے میں ملک العادل،

تقی الدین، ملک العزیز، ملک الفضل، ملک الظاہر، تاج المملوک، طغرل، کیفا، مار دین، حلب

اور موصل کے حکمران، افریقہ، مصر، یمن اور دمشق کے نامی گرامی سردار اور مملوک اس طرح

اپنے گھوڑوں پر سوار کھڑے تھے گویا اب چوگان شروع کرنے کا حکم ملنے والا ہے۔

”فاتحو!“

”جہاں کشاؤ!“

”شرق سے مغرب تک ساری نگاہیں تمہاری تلواروں پر لگی ہوئی

ہیں جو بیت المقدس کی محافظ ہیں، روضہ اطہر کی محافظ ہیں، اسلامی

جاہ و جلال کی محافظ ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہماری فیصلہ کن لڑائی بیت

المقدس کی دیواروں کے نیچے لڑی جائے گی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ

اگر غنیم کا یہ لشکر صحیح و سالم وہاں تک پہنچ گیا اور عہدہ میں بیٹھے ہوئے تین

لاکھ صلیبی سوار کھک پر آ گئے تو ساری دنیائے اسلام خطرے میں

پڑ جائے گی اور جنگ کا نقشہ تبدیل ہو جائے گا۔ تمہارے دین کا دشمن

قوی ہے۔ ان کے لیے چوڑے ہاتھ بیروں پر لوہے کے غلاف ہیں

اور اونچے گھوڑوں پر آہنی پاکھرس ہیں لیکن زمین میں لیے ہوئے

غازیوں اور آسمان پر بیٹھے ہوئے شہیدوں کی دعائیں تمہارے ساتھ

ہیں۔ تمہارا نگہبان دشمن سے قوی تر ہے۔ لڑو اور اس طرح لڑو جس

طرح تمہارے اصحاب بدر میں لڑے تھے، تمہارے اجداد یرموک

میں لڑے تھے اور جس طرح تم خود حنین میں لڑے تھے۔ آج کی

لڑائی کا فیصلہ قلعوں اور شہروں پر نہیں حوصلوں اور منصوبوں پر ہے۔ اپنی

جانبیں دے دو اور دشمن سے اس کے حوصلے اور منصوبے چھین لو۔“

ایمان سنولانے لگا ہے۔ پستی رقاہیں بھڑک اٹھی ہیں، نسلی عداوتیں بیدار ہو گئی ہیں۔ اس لئے تادیبی کارروائی کی ضرورت ہے۔ اس نے بیٹھے ہی بیٹھے کاتب کو طلب کیا۔

ممالک محروسہ کے والیوں اور باجگداز شاہوں کے نام احکام لکھوائے کہ تازہ دم مجاہد روانہ کئے جائیں۔ ملک العادل کو حکم دیا کہ مخصوص رسالوں کے علاوہ تمام لشکر کی رخصت منظور کی جائے۔ ہر کاموں کی تنخواہیں اور روزینے بڑھادیے جائیں۔ آرمودہ کارسرداروں کو بیت المقدس کے مورچوں اور قلعوں کی درنگی کے معائنے بڑھادیے جائیں۔ آرمودہ کارسرداروں کو بیت المقدس کے مورچوں اور قلعوں کی درنگی کے معائنے پر مامور کیا اور قراول کو باریاب کیا جس نے عرض کیا۔

”نہرانی افواج کا سپہ سالار رچڑڈ عکے سے تازہ دم لشکر لے کر آگیا

ہے۔ ایک لاکھ آہن پوش سواروں، چالیس ہزار ترکیوں اور رسد کے

پچاس ہزار اونٹوں اور خچروں کے ساتھ باقا میں داخل ہوا چاہتا ہے

اور مقامی انتظامات سے فارغ ہوتے ہی بیت المقدس کی طرف

بڑھنے کا ارادہ رکھتا ہے۔“

ملک العادل نے اس خبر کو ترڈ سے سنا اور گزارش کی کہ تازہ دم افواج کی آمد سے

پہلے موجود لشکر میں تخفیف و رواندیشی کے خلاف ہے، لیکن اس نے توجہ نہ فرمائی۔ اسی شام

ترکمانوں کا لباس پہنا اور خاص خاص جاں نثاروں کو ساتھ لے کر لشکر کے خفیہ گشت کو نکلا۔

ارحوف کی شہر پناہ کے باہر مشرق سے مغرب تک تمام پہاڑیاں اسلامیوں کے

خیموں سے آراستہ تھیں۔ ابتدائی سرما کے تابدار چاند کی خنک روشنی میں دور دور تک پھیلی

ہوئی مشعلوں کے جگنوڑ رہے تھے۔ الاز کے ازگارے دہک رہے تھے۔ مصر، شام، حجاز، یمن،

افریقہ، کیفا، مارین، حلب اور موصل کے بادشاہوں، امیروں اور سرداروں کی بازگاہیں اپنے

اپنے جانبازوں کے حلقے میں اپنے اپنے نشان اڑاتی، اونچی بھاری مشعلوں کی روشنی میں

مٹانت و استقامت سے کھڑی تھیں۔ کہیں قرآن پاک کی تلاوت ہو رہی تھی، کہیں صحابہ کرام

کی سیرت مقدسہ کا بیان ہو رہا تھا، قادیہ اور یرموک کی فتح کی داستان سنائی جا رہی تھی، الف لیلیٰ

کے افسانے آنکھوں میں مستی پیدا کر رہے تھے، ایام جاہلیت کے شاعروں کے اشعار گائے

صدمہ پہنچا کر دوسرے دار کے لئے علم ہو جاتیں۔ نیزے البتہ کاری وار کر رہے تھے اور غنیمت کی صفوں میں تہلکہ ڈالے ہوئے تھے۔ وہ اپنی فوج سوارہ لئے سرخ جھنڈے کی طرف چلا جس کے داہنے بازو پر تقی الدین یلغار کر رہا تھا اور جسے خود رچڑڈ اپنے نامی گرامی ناسٹ اور نواب لئے سنبالے ہوئے تھا۔ تقی الدین رچڑڈ کے داہنے پہلو کی آہن پوش دیوار توڑ کر اس کے عقب میں پہنچ گیا اور طبقہ البطار کے شہسواروں میں گھر گیا۔ اس نے گھبرا کر تاج الملوک کو حکم دیا کہ تقی الدین کی مدد کو پہنچے اور خود رچڑڈ کے قلب پر چلا۔ ملک الفضل اس کی رکاب سے نکل کر رچڑڈ کے علم دار پر حملہ آور ہوا اور ڈھکیل کر رچڑڈ کے پیچھے پہنچا دیا۔ اب تقی الدین کا رچڑڈ سے سامنا ہو چکا تھا۔ رچڑڈ نے نعرہ لگایا۔

”اے سب!..... اے مہد مسیح ہماری مدد کر۔“

اور دونوں ہاتھوں سے تلوار علم کر کے تقی الدین پر حملہ کیا جسے تقی الدین نے چھتے کی طرح پھرتی سے گھوم کر بچا لیا اور مڑتے مڑتے رچڑڈ کے گھوڑے پر وہ تھلا ہوا ہاتھ مارا کہ تلوار پکھڑ توڑ کر گھوڑے کے سینے میں دھنس گئی اور رچڑڈ بدحواس ہو کر گھوڑے سے پھانڈ پڑا۔ تقی الدین نے خون میں ڈوبی ہوئی تلوار علم کر کے رچڑڈ پر گھوڑا ریل دیا اور قریب تھا کہ اس کا گھوڑا رچڑڈ پر چڑھ جائے کہ آواز آئی۔

”رچڑڈ کو گھوڑے پر سوار ہونے کا موقع دو اور بہادری کی طرح لڑو۔“

رچڑڈ نے خود کو تجھے کے نیچے چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ تقی الدین کے گھوڑے پر رچڑڈ چڑھا ہوا تھا اور وہ لگام نہیں مان رہا تھا اور پھیلے ٹانگوں پر کھڑا ہوا غیظ کا اظہار کر رہا تھا کہ ملک الظاہر نے ایک سلطانی گھوڑا رچڑڈ کو دے کر اس کی حفاظت کو بڑھتے ہوئے نائیوں سے لچھ گیا۔ اب افرنجیوں کا ہجوم ہونے لگا تھا۔ اس نے تقی الدین کو اشارہ کیا اور اپنے سواروں کو نصرانی فوج کے سمندر میں تیراتا ہوا نکل آیا۔



یافا کی لڑائی میں وہ عام مسلمانوں کی کارگزاری سے برہم بیٹھا تھا۔ ملک العادل نے تفتیش کے بعد حکم لگایا کہ مال غنیمت سے لدے پھندے لشکر کی بیوی بچوں کا فراق شدت سے محسوس کرنے لگے ہیں۔ سالہا سال کی مسلسل لڑائیوں سے تھک گئے ہیں۔ جوش

دیئے اور شیخ زانو پر ہاتھ مار کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا سر جھولتے ہوئے فانوس سے ٹکراتے ٹکراتے بجا۔ شیخ نے نیچے اتر کر ہمیں پہنچے، ہندے کی دیوار کے قریب رکھی ہوئی اخروٹ کی تپائی پر سلگتے عود کی انگلیٹھی میں اپنے ہاتھ ملے اور داڑھی پر پھیر کر گر جا۔

”ترکان سردار کے لئے نارگیلی لاد، نقل کی کشتیاں اور نبیذ کے پیالے پیش کرو کہ شام کی رات کو یہی زیور دلہن بنا دیتے ہیں اور آل تغلب..... اپنے پری نژاد گھوڑوں پر سوار ہو جاؤ کہ ہمارے تخت رواں ہیں ... فولاد کی بیٹیاں نیاموں کے جلوں سے نکال کر پہلو سے لگا لو کہ یہی شجاعوں کی معشوقائیں ہیں اور ہمارے جلو میں چلو کہ ہم ہی دنیا کے فاتح ہیں۔“

”ترکان سردار ہمیں رخصت کر کہ بخت فتح کے گھوڑے کی رکاب تھامے کھڑا ہے۔ آل تغلب کی تاریخ زریں کی قسم ہماری خواہش تھی کہ میزبانی کے آداب بجالائیں لیکن ایک مہتاب ہماری کند کاں انتظار کر رہا ہے اور اس کی گرفتاری ہم کو غازی سلطان اعظم کی نگاہ میں وہ مرتبہ عطا کرے گی جس پر کیفا اور مار دین کے بادشاہ مدتوں رشک کیا کریں گے۔“

”کیا ہم شیخ کے ہرکاب ہونے کا شرف حاصل کر سکتے ہیں؟“

”نہیں معزز سردار..... یہ آئین میزبانی کے خلاف ہے۔“

شیخ اپنے ساتھیوں کے ساتھ خیمے سے نکل گیا اور طغرل نے اس کے کان میں کہا۔

”شیخ کسی بڑی مہم پر جا رہا ہے۔ کیوں نہ اس کا پیچھا کیا جائے۔“

”ضرور۔“

چشم زدن میں وہ گھوڑے حاضر کئے گئے جن کی صبار فاری عرب میں ضرب الشل تھی۔ گلابی چاندنی رات میں شیخ کے گھوڑے دھبوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ ارسوف کے جنوب مغرب کے ہموار راستوں پر ان کے گھوڑوں کی ٹاپیں قریب ہو گئیں۔ پھر تلواریں کھنکنے لگیں اور رجز برسنے لگے۔ طغرل نے آداب سلطانی کو نظر انداز کیا اور کوڑا چکا کر شیخ

جا رہے تھے اور قبائل کے افتخار سنائے جا رہے تھے اور نبیذ کے دور چل رہے تھے، کمائوں کا چمڑا سنا جا رہا تھا، ہتھوڑوں پر بازو رکھی جا رہی تھی، نیزوں کے پھل زہر میں بجھائے جا رہے تھے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کی جا رہی تھی۔ اب وہ ایک عربی بارگاہ کے سامنے آ گیا جس پر بنو تغلب کا نشان لہرا رہا تھا اور اس کے تین طرف چھوٹے چھوٹے خیموں کا محلہ آباد تھا۔ داخلے پر زمین میں گڑی مشعلیں روشن تھیں۔ عرب مجاہد الاد کے گرد بیٹھے کسے ہوئے گھوڑوں کو سامنے کے صحرا کا مشہور گیت گارہے تھے۔

یہ دھوپ سے سلگتا ہوا سیاہ صحرا جس میں بھٹک رہا ہوں

اس ریگستان سے کہیں چھوٹا اور شاداب ہے جو میرے سینے میں آباد ہے

وہاں تو کوئی مجھ جیسا مسافر بھی نہیں

میرے نقش پا جیسے خاموش ہمارا ہی بھی نہیں

بولی کے کانوں کی رہبری بھی نہیں

ریت، دھوپ، سموم اور قاتل تنہائی!

آہ ہنت عم..... اپنی محبت کا تو شدید کچھ۔

وہ عام ترکان سرداروں کی طرح پردہ ہٹا کر خرگاہ میں داخل ہو گیا۔ اونٹ کی کھالوں کی وسیع و عریض چھت کے نیچے ہندے کی بھوری مغربی دیوار کے نیچے تختوں کی قطار پر مختلف رنگوں کی قالین بچھے تھے۔ چری غلاف کا بھاری تکیہ پشت سے لگائے ہوئے شیخ بیٹھا ہوا تھا۔ یمنی چادر کی کتھی عبا پر سیمیں کمر بند میں جڑاؤ خنجر لگا تھا۔ سر کے سفید رومال میں زرکار ڈوری بندھی تھی۔ سیاہ بھری ہوئی گول داڑھی میں سفید بال جھللا رہے تھے، دباغت کئے ہوئے زرد چمڑے کے موزے فانوسوں کی روشنی میں چمک رہے تھے، ندیم دوزانو بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے کانسی کی لگن میں سرخ انگارے چھڑے تھے اور فرش پر درد لیش نما عرب حلیوں کی لڑائی کا قصیدہ گارہا تھا اور اس کی عبا کے گھیر دار دامن حلقہ بنا کر ناج رہے تھے۔ دو عرب رہاب اور کمنجہ بجانے میں اہنا د جو در فراموش کر چکے تھے۔ نگاہ ملتے ہی شیخ نے اٹھتے ہوئے مرحبا کا نعرہ لگایا۔ اس کے ساتھیوں کو تخت پر بٹھا کر اپنا تکیہ اس کی پشت سے لگا دیا۔ وہ قصیدے کے اشعار کی داد دے رہا تھا کہ ایک عرب نے آکر شیخ کے کان پر اپنے لب رکھ

کے ساتھیوں کو جالیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک کسن نصرانی سردار کے ساکت کھڑے ہوئے گھوڑے کے چاروں طرف آہن پوش عیسائیوں کی خاصی معقول تعداد پروانہ دار اڑ رہی ہے اور شیخ کے مٹھی بھر ساتھیوں پر غالب آتی جا رہی ہے۔ طغرل نے گھوڑا ریل کر نعرہ لگایا۔

”بذنیب نصرانیو! اٹھیا رڈال دو کہ بادشاہوں کا بادشاہ تمہارے سامنے کھڑا ہے۔“

اس آواز نے گویا نصرانیوں کے بازو اتار لیے اور شیخ کے ساتھیوں میں آگ لگادی اور ایک ایک کر کے سبھوں نے ہتھیار پھینک دیئے۔ شیخ کے ہمراہی انھیں کندوں میں باندھنے لگے اور وہ نوجوان عیسائی سردار گھوڑے پر بیٹھا اسے گھورتا رہا جس کی شخصیت عامیوں کے لباس میں بھی سطوت شاہی سے آراستہ تھی۔ اس نے قیدی طغرل کے حوالے کئے اور قیام گاہ کی طرف ہاگیں اٹھا دیں۔

ابھی اس کا گھوڑا اٹھلایا جا رہا تھا اور وہ سراپردہ خاص میں کھڑا بنائے ہوئے گول انگاروں سے ہاتھ سینک رہا تھا اور خادم بکتر کھول رہے تھے کہ وہ نوجوان صلیبی سردار پیش کیا گیا جس کا رنگ سفید، آنکھیں نیلی اور خود سے نکلے ہوئے بالوں کے گچھے سرخ تھے۔ سفید بکتر میں وہ ایک کسن لڑکے کی طرح کھڑا ہوا خوف سے کانپ رہا تھا۔ ہیرے کی صلیب پر نظر پڑتے ہی اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اس نے تھوڑی دیر خاموش رہ کر اپنی آنکھیں اس کی شرمیلی آنکھوں میں ڈال دیں۔

”میرے قریب آؤ۔“

”ڈر نہیں۔“

”تم کچھ کہنا چاہتے ہو..... کہو۔“

”میں..... میں نے جب تک آپ کو دیکھا نہیں تھا آپ کے نام سے خوف لگتا تھا۔ لیکن اب..... جب کہ میں آپ کے سامنے ہوں مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔“

”ہم تو ایک جیونی کو بھی نقصان یا فائدہ پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتے اور اگر ہمیں خدا قوت عطا بھی کر دے تو ویلینور کی بیٹی کو ہم سے فائدہ..... صرف فائدہ ہی پہنچے گا۔“

ویلینور کی بیٹی کی فولادی موزوں میں جکڑی ہوئی سبک چڑیاں کانپنے لگیں اور

اس نے آگے بڑھ کر چین کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور سر سے پاؤں تک عام شامی لڑکیوں کی طرح شرم کا مجسمہ بن گئی۔ اس نے چین کو اپنے پاس تخت پر بٹھالیا اور سراپردہ سلطانی اس کی آواز سے گونج گیا۔

”طغرل!“

”دین پناہ!“

”خبرزادی چین کے ہم رکابوں کو آرام سے رکھو۔ زخیوں کو طیبیب خاص کی نگرانی میں دے دو اور ملک العادل کی کینروں کو حکم پہنچا دو کہ شاہزادی کی خدمت میں حاضر ہوں۔“

ہر چند کہ رات بڑھنے لگی تھی تاہم ان امیروں کو طلب کیا گیا جو سامان بادشاہی کے امین تھے۔ قیام گاہ شاہی کی پشت پر وہ دوسرا پردہ نصب کیا گیا جس کے تین درجے تھے اور تمام شہیر چاندی کے تھے۔ چھت اور دیواریں دیبائے رومی کی تھیں، پردے یکنی چادروں کے تھے اور فرش بے نظیر قالینوں کا تھا اور جسے بغداد کے امیر المومنین نے فتح بیت المقدس کے وقت تحفہ میں بطور خاص عنایت کیا تھا۔ اس میں سونے کا وہ پلنگ بچھایا گیا جسے آرمینیا کے بادشاہ روپن نے نذر میں گزارا تھا۔ زریں دسبیس کرسیاں دتپائیاں، انگلیٹھیاں، فانوس، آفتابے اور زرکار شیشے کے آلات و ظروف سجائے گئے جو سلطان مقدونیہ نے خراج میں پیش کئے تھے۔ مغرب کی حسین ترین کینریں مشرق کے بھاری جوڑوں اور جڑاؤ زیوروں میں جگمگاتی ہوئی خدمت کو حاضر ہوئیں۔ وہ بنفس نفیس شاہزادی چین کی رفاقت کو اٹھا۔ اصرار کر کے کھانا کھلوا دیا اور کینروں کو دلجوئی کی تاکید کر کے واپس ہوا۔ ساری رات بیدار رہ کر اور لشکر کو ہوشیار رکھ کر ایک کشمکش میں گزار دی۔

صبح ہوتے ہی بیان کیا گیا کہ سلطنت انگلیٹھیا اور دوست صقلیہ کے چند مشہور امیر بھی شاہزادی کے ہم رکابوں کے ساتھ گرفتار ہوئے ہیں جنہیں شاہزادی کی بارگاہ میں باریاب ہونے کا حکم دیا گیا۔

چین کینروں کے جھرمٹ میں زرد کفتان پر صلیب پہنے سلام کو حاضر ہوئی۔ غلاموں نے وہ کشتیاں پیش کیں جو ممالک اسلامیہ کے بیش بہا زیورات، ملبوسات اور نوادرات سے لبریز تھیں۔ تمام نعمتوں کو صندوق میں بند کیا گیا۔ ڈیوڑھی پر ان سواروں کے گھوڑے

ہنہانے لگے جنھیں شہزادی کے جلو میں چلنے کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ پھر طغرل نے عیسائی امیروں کو پیش کیا جو خالی نیام پہنے، رخصوں پر پٹیاں باندھے، بے یقین آنکھیں کھولے گوگوں کی طرح کھڑے تھے۔ جین رو انگی کے لئے آہنی لباس پہنے۔ سرپردہ خاص کے دوسرے درجے میں چلی گئی اور ملک العادل باریاب ہوئے۔ رچرڈ کا فوراً آیا ہوا خط پیش کیا جس پر نگاہ ڈالتے ہی مزاج مکدر ہو گیا۔ کاتب طلب ہوا۔ عیسائی امراء اور مسلمان سرداروں کی موجودگی میں جواب لکھوایا۔

”خدا کے ناچیز بندے، رسول کے ادنیٰ خادم، بادشاہوں کے بادشاہ یوسف ابن ایوب صلاح الدین غازی کی طرف سے جزیرہ انگلستان کے فرمانردا کے نام۔

تمہارے خط سے جس گستاخی کو بو آتی ہے وہ درحقیقت ہماری اس مشرقی روایتی خاکساری کی دین ہے جسے ہم جزو شرافت اور خاصہ انسانیت خیال فرماتے ہیں اور جس کے اظہار پر ہم نادم نہیں ہیں۔ تحریر کی ہوئی یہ خواہش کہ ہم اپنے مقام سے اتر کر تمہاری صف میں کھڑے ہو جائیں اور گفت و شنید فرمائیں، منظور نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے کہ جزیرہ انگلستان جیسی سلطنت رکھنے والے کتنے ہی حکمران تخت سے اتر کر پایادہ چل کر ہمارے سفیروں کا استقبال کرتے ہیں۔ تم افرنجی لشکر کے سپہ سالار ہو۔ تمہارے اس شرف کا لحاظ کیا گیا اور عسا کر اسلامی کے سالار اعظم کو اس کے مراتب کا خیال نہ فرماتے ہوئے تم سے گفتگو کا حکم دیا گیا اور نہ کسی ہمرکاب اور باجگداز کو اس خدمت پر مامور کیا جاتا ہے۔

ہم تم کو شرف ملاقات سے محروم رکھتے ہیں اس لئے کہ ہمارے خون میں شامل مہمان نوازی کو چھوٹی سی ریاست کا مغرور بادشاہ اپنی بزرگی اور برتری پر محمول کر سکتا ہے اور اس کی زبان بے لگام ہو سکتی ہے۔ تم اپنے خوشامدی درباریوں اور متعصب مہورخوں کی طرح عکے کی فتح

کا بڑی دھوم دھام سے ذکر کرتے ہو۔ اگر ہمارا خیال صحیح ہے تو تم اور تم جیسے دوسرے بادشاہ مسیحی دنیا کی ساری قوت سمیٹ کر ہزاروں میل کا سفر طے کر کے صرف عکے فتح کرنے نہیں آئے تھے۔ گمان غالب ہے کہ تم بیت المقدس کی بازیابی کے ارادے سے آئے تھے۔ لیکن نتیجہ کیا ہوا؟ افرنجیوں کے ناعاقبت اندیش سپہ سالار نے چار لاکھ..... شہسواروں کی آتش جہاد کو عکے کی طوفانی اور لایعن لڑائیوں میں خاکستر کر دیا۔ اسلامیوں کے ناخدا نے چار لاکھ تلواریں کے طوفان سے بیت المقدس کے سفینے کو محفوظ رکھ کر عکے کے ساحلوں میں ہی اسے غرق کر دیا اور اب عکے کی ”فاتح“ فوجیں بیت المقدس کے جوار میں پڑی ہوئی واپسی کی گھڑیوں کا انتظار کر رہی ہیں۔

مغلوب الغضب بادشاہ افرنجی لشکر اگر ہمارے کسی سپہ سالار کے ہاتھ میں ہوتا تو وہ عکے کو مقامی فوجوں کے حوالے کر کے عسقلان پر یلغار کرتا اور عسقلان سے بیت المقدس تک کے سارے علاقے کو جوش جہاد سے پاگل آہن پوش اور بے نظیر سواروں سے بھر دیتا اور پانچ بادشاہوں کے کمان میں سارا لشکر بیت المقدس کی فصیلوں پر چڑھ دیتا لیکن ایسا اس لئے نہیں ہو سکا کہ مسیحی دنیا کا کوئی ایک بادشاہ کسی لشکر کے ساتھ عساکر ایوبی کے سامنے آنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ عزیزم! تمہاری جتنی عمر ہے اتنی ہم نے لڑائیاں لڑی ہیں اور جیتی ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے، تم نے سنا ہو گا کہ فاتح فوجیں مفتوح پر اس طرح گری ہیں جیسے بیا سا گھوڑا چشمے کی طرف چلتا ہے، لیکن تمہاری ”فاتح“ فوجیں دنیا کے سب سے بڑے بحری بیڑے کی حفاظت میں ہموار راستوں پر ایک دن میں ڈھائی میل چلنے سے عاجز ہیں۔

بادشاہ فاتح، مفتوح کو اپنی بہنیں نہیں پیش کرتے۔ تم ایسے فاتح ہو کہ مفتوح کو ایسی ہتک آمیز رشوت دے ڈالنے پر مجبور ہو گئے اور ہم

ہمارا نائب السلطنت اور سالار اعظم ملک العادل تم سے ملنے تھا قیام گاہ پر گیا تو اس کے ساتھ پانچ ہزار سوار ایسے تھے جن کے ریشمیں اور ادنیٰ کفتانوں پر سونے کے تاروں کا کام تھا، ان کے کمر بند طلائی تھے، ان کے ہمیز زریں تھے، ان کے ہتھیار جڑاؤ تھے اور ان کے خود میں عقاب کے پردوں کی کلغیاں تھیں، لیکن وہ ہمارے عام سپاہی تھے۔ ہر معرکے میں ہم نے ایسے سپاہی کھوائے ہیں لیکن ان کی تعداد تمہارے مقتولین کے مقابلے میں کہیں کم ہے۔ پوری تیسری صلیبی لڑائی میں ہمارے لشکر کا کوئی بھی نامی گرامی سردار نہ زخمی ہوا اور نہ شہید ہوا ایک الہ کاری کے جوعلہ میں گرفتار ہو گیا اس لئے کہ ہم نے تم سے ابھی تک کوئی فیصلہ کن لڑائی نہیں لڑی۔

تم بیت المقدس پر اپنے پروردگار کا ذکر اس طرح کرتے ہو گویا وہ جزیرہ انگلستان کا کوئی گر جا ہے جہاں تمہاری پیشوائی کے لئے تحمیل راستے گلباری کا انتظار کر رہے ہیں۔ بیت المقدس کی فصیلیں ثابت ہیں، مورچے موجود ہیں، دمدے قائم ہیں، اطراف کی آبادیاں دیران کی جا چکی ہیں، کنوؤں میں زہر ڈال دیا گیا، میدانوں میں گو کھرد بچھا دیئے گئے اور صلاح الدین کے سپہ سالار جو دمشق سے اس کے جلو میں نکلے تھے، زندہ ہیں، سلامت ہیں اور ان کی تلواریں تمہارے خون کی پیاسی ہیں، منتظر ہیں۔

شام کی سردی جس کے تم شاکی ہو، انگلستان کے برف بار موسم سرما سے جس کے تم عادی ہو، کہیں کم ہے۔ برف باری اور ذالہ باری کی شکایت تو ہم کو کرنی چاہئے جس کا بیشتر لشکر صحراؤں کی کڑی دھوپ کا تربیت یافتہ ہے اور عسقلان؟ ہم عسقلان کو بحری ڈاکوؤں کا آرام خانہ بننے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اس کو بنیادوں سے اکھاڑ کر پھینک دینا ہوگا۔ ہم اس فیصلے پر اٹل ہیں۔ بیت المقدس پر اسی طرح قابض

ایسے مفتوح ہیں کہ ایسی خوبصورت لالچ پر بھی غالب آ گئے۔

تم نے یا فا اور ارسوف کے معرکوں کا ذکر کیا ہے اور اپنی فتوحات پر فخر کیا ہے۔ خود اپنے قول کے مطابق تم علکہ سے ڈیڑھ لاکھ چیدہ شجاعوں کے فاتح لشکر کے ساتھ نکلے تھے۔ یا فا پر تم نے اپنی طاقت کا جائزہ لیا اور اس بات پر مجبور ہوئے کہ علکہ جاؤ اور باقی ماندہ ”فاتح“ فوج کو ساتھ لاؤ۔ تم نے علکہ میں مقدس صلیب کا واسطہ دیا، مہدی مسیح کی تفسیں دلائیں اور ایک لاکھ سواروں کے ساتھ یا فا پر زور کیا اس حساب کی رو سے اس وقت تمہارے پاس ڈھائی لاکھ لشکر ہونا چاہئے لیکن تمہارا اور تمہارے قاصدوں کا بیان ہے کہ تمہاری کمان میں صرف ڈیڑھ لاکھ سوار ہیں تو پھر باقی ایک لاکھ سوار کیا ہوئے! کہیں ہماری مفتوح فوجوں کی تلواروں کا غلاف تو نہیں ہو گئے۔

سپہ سالار! تمہارے گھوڑے ہمارے گھوڑوں سے مضبوط ہیں، آہنی پاکھروں سے آراستہ ہیں۔ تمہارے سوار قوی اور لائے ہاتھ پیروں کے علاوہ خود پوٹ اور بکتر سے پیراستہ ہیں اور تمہاری تعداد ہر جگہ اور ہر معرکے میں ہماری تعداد سے کہیں زیادہ رہی ہے۔ پھر ہم جو تمہاری طرح انسان ہیں ہلکے ہتھیاروں، چھوٹے گھوڑوں اور ان سواروں کے ساتھ جو ایک جست میں اپنے بیوی بچوں تک پہنچ سکتے ہیں، تمہاری مکمل تباہی کا منصوبہ بنا کر کس طرح یا فا اور ارسوف میں معرکہ آرا ہو سکتے تھے۔ ہم نے علکہ کی طرح یہاں بھی تم کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کی کوشش کی اور خدا کے فضل سے کامیاب ہوئے۔ تمہاری مکمل تباہی بیت المقدس کے میدانوں میں مقدر ہو چکی ہے۔ جہاں کئی لاکھ غازیوں کی تلواریں تمہاری انتظار کر رہی ہیں۔ یا فا اور ارسوف کے میدانوں میں جن شہیدوں کی لاشیں تم نے پائی ہیں وہ ہمارے عام سپاہی ہیں۔ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا کہ جب

رہیں گے جس طرح ہیں۔ اسلام نے دوسرے مذاہب کے مقامات مقدسہ کی تحریم کا سبق دیا ہے جو ہمیں یاد ہے۔ اس لئے عیسائیوں کو زیارت کی اجازت عطا کی گئی، اجازت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ اس سے زیادہ ایک اینٹ نہیں، ایک دانہ نہیں، ایک لفظ نہیں۔

عزیزم! تمہاری غریب الوطن فوجیں خستہ ہو چکیں۔ فریڈرک مرچکا، بادشاہ فرانس واپس جا چکا۔ بڑے بڑے نواب، بیرن، ٹائٹ، سردار اور سوراخاک کا پیوند ہو چکے۔ تمہاری ننھی مٹی ریاست تمہارے ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے۔ تمہارا بھائی، تمہارا قائم مقام اپنی تاج پوشی کا منصوبہ بنا رہا ہے اور تم واپس جا رہے ہو بلکہ جہاز یوں کو کوچ کا حکم دے چکے ہوتا ہم جنگ کی دھمکی دے رہے ہو۔ ہم اپنے وطن میں اپنے عزیزوں کی قربت سے آسودہ ہیں۔ کوئی نعمت ایسی نہیں جو ہماری حضوری سے مشرف ہو سکتی ہو۔ کوئی دنیاوی خواب ایسا نہیں جس کی تعبیر ہمارے حضور سے مودب نہ گزری ہو۔ اس صلیبی لڑائی کو، اس جنگ عظیم کو صلاح الدین نے تنہا جھیلایا ہے۔ عالم اسلام کا کوئی تاجدار ایسا نہیں جس نے ہماری مدد کی پیشکش نہ کی ہو اور جسے ہم نے ٹھکراندیا ہو۔ تاہم اے بادشاہ اگر بیت المقدس کی حفاظت کے لئے ضرورت ہوئی تو ہم عالم اسلام کے ایک ایک بادشاہ اور ایک ایک فقیر کے سامنے دست سوال دراز کریں گے اور اس وقت تک لڑتے رہیں گے جب تک ایک ایک سپاہی شہید نہیں ہو جاتا۔ عہدہ کے چار ہزار بے گناہ اور ایمان پائے ہوئے مسلمانوں کے قاتل، تمہاری بہن اس شان کے ساتھ جو ایک بادشاہ زادی کے شایاں ہے، رخصت کی جاتی ہے۔“

خط کو ملک العادل کے حوالے کر کے وہ سراپردہ خاص کے اندر چلا گیا جہاں چین

رخصت ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔

قصر دمشق کے پہلو میں بنی ہوئی مسجد کے مینار سے بلند ہوتی ہوئی پرسوز اذان کی آواز نے سلطان اعظم کے بہتے ہوئے خیالوں کی روانی رد کر لی۔ وہ بے چینی سے اٹھے۔ وضو کر کے جانماز پر کھڑے ہو گئے۔ جب تک سورج کی کرنیں سلام کو حاضر نہ ہوئیں وہ اسی طرح درد و غم و غم میں مشغول رہے۔ باریاب ہونے والے پہلے غلام کو بیٹھے ہی بیٹھے حکم دیا۔

”مغرب سے آئے ہوئے اسقف کو طلب کیا جائے۔“

زندگی کی بہترین یادوں سے لدا ہوا وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے اٹھے، سنگ مرمر کی جالیوں کے پردے کو پکڑ کر درتچے میں کھڑے ہو گئے۔ قصر کے رد کار کے سامنے سارا میدان نوبت کی آوازوں اور مصری سواروں کی زرد عباؤں، ہتھیاروں اور گھوڑوں سے چھلک رہا تھا۔ نشانوں کے زرد دوز پھیرے آفتاب کی چمکیلی روشنی میں جگمگا رہے تھے۔ ان کے دونوں ابرو پیشانی پر چڑھ گئے۔ ”کیا تقی الدین؟“

”کیوں؟“

انھوں نے سوچا۔ پھر نیچے اترے۔ جاں نثاروں کے سلام قبول کئے۔ باب الداخلہ کی شہ نشین پر بچتی ہوئی نوبت کی شیریں آوازیں ریگ رہی تھیں۔ دمشق کے گلابوں سے سارا صحن گلزار تھا۔ رات کے محافظ سوار اُلیس کرتے، گھوڑوں کو رانوں میں دابے، سنگین چوہرے کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ مملوکوں کی کمان میں کردوں اور سلجوقوں کے دستے ان کی جگہ سنبھال رہے تھے۔ بادامی چمڑے کے پاپوش پہنے وہ مچھلیں سبزے پر ٹپکتے رہے، پھولوں کی رنگ، قامت اور خوشبو سے محفوظ ہوتے رہے۔ اپنے شکاری چیتوں کی آنکھوں سے چشم پوش کھلوئے۔ ان کی گردنوں پر تھکیاں دیں۔ عقابوں، بازوں اور شکرہوں کے جوڑے ملاحظہ کئے۔ محبوب شیرازی کبوتروں کے جوڑے ہاتھ میں لئے۔ امیر شکار سے باتیں کر رہے تھے کہ ملک الفضل اور ملک الظاہر طبیب خاص کے ساتھ حاضر ہوئے۔ غلاموں نے سبزے ہی پر کرسیاں لگا دیں۔ طبیب نے نبض دیکھ کر حکم لگایا۔

”خدائے بزرگ دبر تر کا شکر ہے کہ مزاج عالی رو بہ صحت ہے لیکن مکمل صحت

سے قبل معمولات جہان بینی سے اجتناب کیا جائے۔“

سلطان مسکرا دیئے۔ نگاہ اٹھائی تو دیکھا اتنی الدین آ رہا ہے۔ گول گندی چہرہ، سیاہ چھوٹی کیلی داڑھی، اونچا بھاری بدن، سفید کفتان پر زرد کمر بند میں وہ سرفراز تلواریں جو ہٹین کی فتح پر سلطان نے اس کی کمر میں باندھی تھی۔ طربوش میں عقاب زریں کے پروں کی کلنی لگی ہوئی کفتان کے دامنوں سے جھانکتے ہوئے طلا کار چری موزے پہنے پنے تلے قدم رکھا قریب آگیا۔ تلوار کو بوسہ دے کر غلاف کر لیا اور سر جھکا دیا۔ سلطان نے بیٹھے ہی بیٹھے ہاتھ بڑھا کر اس کے بازو پر تھپکی دی، وہ تن کر کھڑا ہو گیا۔

”آمد کا سبب۔“

”نائب السلطنت کا فرمان۔“

پھر سلطان مسکرا کر کھڑے ہو گئے اور اندرون محل کے دروازے کی طرف چلے۔ عمر رسیدہ خواجہ سراؤں نے لپک کر اطلاع کی۔ کینروں کی رفتار مذہم ہو گئی اور گفتار مودب۔ سلطان صحن ہی میں تھے کہ خاتون شام پیشوائی کو آئیں۔ مزاج پرسی کی اور ان کورات میں دیکھا ہوا بیداری کا خواب ستانے لگا۔ محسوس ہوا جیسے جین نے استقبال کیا ہو۔ سلام کے جواب میں بہن کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ دو چار کی باتیں کیں اور حجام کی طرف چلے۔ مزاج شناس غلام دور نے لگے۔ عربی درجوں کے جلی شیشوں پر کینی پردے برابر کر دیئے گئے۔ معطر پانی پڑے ہی بدن کے روئیں جھج کر کھڑے ہو گئے۔ جسم کانپ اٹھا۔ غصے کو ضبط کر کے دھیمی آواز میں فرمایا۔

”قتل کرنے کا ارادہ ہو تو بتا دو۔“

جلدی جلدی کپڑے پہنے اور سواری چادر اڑھ کر باہر نکل آئے۔ زریں نقش و نگار سے آراستہ سرسریں محرابوں اور پشت پہل ستونوں کے چمکیلے دالان میں گلابی دھوپ اپنے چمکیلے سہرے پر پھیلائے لیٹی ہوئی تھی۔ وسط میں بچھے ہوئے چاندی کے دیوان پر آکر بیٹھ گئے۔ شاہزادہ ظفر کفتان پر چاندی کے کمر بند میں ننھا سائینچہ باندھے سلام کو حاضر ہوا۔ اس سے مسکرا کر باتیں کیں۔ چند تولے شیر بادام کا ناشتہ کیا اور اس کی انگلی پکڑ کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دیوان عام میں گئے۔

۱۔ سلطان کی بہن کا لقب۔

چھت پر محلول جواہرات کی نقاشی تھی۔ دیواروں پر سونے کی استرکار اینٹوں کی آرائش تھی، زرد قالینوں کے فرش پر چھوٹا سا آبنوی تحت بچھا تھا اور دروازوں پر سالیس کے پردے کھڑے تھے۔ انھوں نے زرد کیوں سے پشت لگا لی اور وزیر ابوبکر نے عرضیاں پیش کیں۔ ایک غلام ہاتھی دانت کا قلمدان لئے کھڑا تھا۔ عرضیاں پڑھتے رہے۔ ایک شخص گزر گزرتا ہوا بڑھا۔ قالین پر پڑے ہوئے عبائے سلطانی کے دامن پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ پشت کی صف سے ایک غلام چاندی کا عصا لے کر نکلا اور اس کی گردن دیوچ لی۔ سلطان نے قلم روک کر غلام کو خشک گھسیں نگاہ سے دیکھا اور فرمایا۔

”غرض مند اندھا ہوتا ہے۔“

دو پہر کے وقت جب ایک ایک سوالی کا سوال پورا ہو چکا اور قحطان پر نگاہ پڑی تو اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسے ساتھ لے کر چلتے چلتے حکم صادر فرمایا۔

”گھوڑے تیار ہوں۔“

دستر خوان پر خاصہ چنے والے خواجہ سرا سے فرمایا۔

”آج طبیعت ٹھیک ہے اور پرہیز سے زبان بد مزہ ہو گئی ہے۔ چادل اور دودھ کھانے کی خواہش ہے۔“

دستر خوان پر چادلوں کی قایمیں جن دی گئیں جن سے زعفران کی خوشبو آ رہی تھی اور گاڑھے دودھ کے پیالے رکھ دیئے گئے۔ قحطان اور نندیوں کو اصرار کر کے اپنے ساتھ بٹھایا۔ مزے لے لے کر اور سیر ہو کر کھایا۔

ظہر کے بعد خلوت شاعی سے برآمد ہوئے۔ بارگاہ کے سیاہ سنگین چبوترے کے نیچے محل اور سونے کے ساز پہنے وہ درجنوں گھوڑے کھڑے تھے جن کا روئے زمین پر جواب نہ تھا۔ قحطان کو حکم دے کر گھوڑا پسند کرایا اور خود اس ”ابلق“ کی پیشانی پر ہاتھ پھیرنے لگے جس کے سینیں ایال گردن کے نیچے تک ٹنک رہے تھے اور جوزریں رکائیں پہنے تصویر کی طرح کھڑا تھا۔ عالم اسلام کے سب سے بڑے شہسوار کی سواری سے مشرف ہونے کے لئے بجلی کی طرح تڑپنے لگا۔ قصر کے پھاٹک سے نکلتے ہی دردیہ کھڑی ہوئی ملک شہسواروں کی قطاریں حرکت میں آ گئیں۔ وہ دمشق کی آبادی سے کتر کر شہر پناہ کے مغربی دروازے

کے محافظوں کے سلام لے کر شہر سے باہر آ گئے۔ ایک ہزار خاص برداروں نے ایک میل کے قطر کا حلقہ بنایا اور سلطان اعظم کو اپنی حفاظت میں لے کر جنگل کی طرف چلے۔ سلطان نے اشارے سے قحطان کو اپنے قریب کر لیا۔ ندیم گھوڑے بڑھا کر ادھر ادھر ہو گئے۔

”کل ہماری طبیعت بھی بحال نہیں تھی اور ہم نے تم کو ٹھیک سے پہچانا بھی نہیں تھا۔“

”تمہارے بال تو ہم سے بھی زیادہ سفید ہو گئے۔“

”موٹے ہو کر کچ کچ پادری معلوم ہونے لگے ہو۔“

اور ایک قہقہہ لگایا جس نے قحطان پر مسند رعب سلطانی کو دھوڑالا۔

اس نے اپنے آپ کو گفتگو پر آمادہ کر لیا۔

”اس خطرناک سفارت پر تمہارے انتخاب کے معنی یہ ہیں کہ ایلینو رکو تم پر مکمل

اعتماد ہے۔“

”سلطان اعظم! اس لفظ سفارت کو تاریخ کی کتابوں میں پڑھا تھا۔ فرانس و انگلستان

کے درباروں میں برستے ہوئے دیکھا تھا لیکن اس کی نوعیت اور نزاکت کا اس وقت احساس ہوا جب آداب حکومت کے عجایب میں جھلملاتی ہوئی آنکھوں..... شاہی آنکھوں نے ایک عورت کے دل کی پیا مبری کا حکم دیا۔“

”عالم پناہ! اگر میں ادیب ہوتا..... خطیب ہوتا تو ان پر جلال اور خاموش آنکھوں کی داستان آپ کے حضور پیش کر دیتا جسے میرے دل نے سنا تھا..... اگر میں مصور ہوتا تو وہ منظر کھینچ دیتا جسے میری نظروں نے دیکھا تھا۔“

”شہنشاہ! کاغذ کا وہ ٹکڑا جسے میں نے حضور میں گزارا ہے کئی راتوں کی جان لیوا بیداریوں میں مکمل ہوا ہے..... میرا سامان سفر تیار تھا۔ میں روز صبح بارگاہ خاص پر حاضر ہوتا اور ناکام پھر آتا..... اس صبح جب مجھے باریاب کیا گیا، آسمان سے زمین تک سرمئی دھند چھائی ہوئی تھی۔ خواب گاہ کے فانوس روشن تھے، بے شکن بستر شب بیداری کا غماز تھا اور ملکہ عالیہ چاندی کی کرسی پر زرد چمک کا بے داغ شب خوابی لباس پہنے شانوں پر سونہ کی چادر ڈالے کرسی کے دستے پر کھنٹی ٹیکے، تھیلی پر چہرہ لئے ساکت بیٹھی ہوئی تھیں..... عالم پناہ..... وقت ان کے حضور سے سو ڈب گزرا ہے..... ماہ و سال کی گردش نے ان کے چہرے سے

شوخی کے وہ پھول توڑ لئے جو شوکت جہاں بانی کو زیب نہیں دیتے اور ان کی پڑ جلال شخصیت کو برگزیدہ دلکشی کا وہ تاج پہنا دیا جو کبھی کبھی کسی خاکی کو عطا ہوتا ہے۔“

”شاہ فرانس سے ان کے تعلقات اس حد تک کیسے خراب ہو گئے کہ لوہے کی تلواریں

تک جا پہنچی؟“

”غلام کو حیرت ہے کہ سلطان اعظم یہ سوال فرما رہے ہیں۔“

”کیوں؟“

”ملکہ عالیہ وہ چند دن فراموش نہ کر سکیں جو انھوں نے دریائے زرخشاں کے

کنارے مشرق کے ہونے والے شہنشاہ کی قربت میں گزارے تھے۔ وہ سپردگی جو انھوں

نے سلطان اعظم پر نچھاور کر دی لوئی کو نصیب نہ ہو سکی۔ فرانس پہنچنے کے چند ہی روز بعد

انھوں نے تیسری صلیبی جنگ کا خواب دیکھا اور اس کی تعبیر کی جستجو نے لوئی کے شک کو یقین

میں بدل دیا اور تعلقات ختم ہو گئے۔“

”جب تیسری صلیبی جنگ برپا ہوئی تب تو وہ مشرق میں ورود کر سکتی تھیں۔“

”ارشاد عالی درست ہے..... یہ ان کے منصوبے کا دوسرا حصہ تھا، لیکن شہزادہ

جون کو تنہا چھوڑنا آئین حکومت کے خلاف سمجھا گیا۔ اگر ملکہ عالیہ بھی رچہڑ کے ساتھ نظر بند

ہو گئی ہوتیں تو انگلستان کا قصہ ختم ہو چکا ہوتا۔ ان کی موجودگی نے ہی تخت شاہی کو جون کے

قدموں سے بچائے رکھا۔“

شاداب پہاڑوں کی سرسبز گھاٹیاں، خوشبودار جھاڑیاں، گنگنا تے ہوئے جیسے،

بلبلوں کے گھنگھر دہنے، ناجاتی ہوئی دہلی پتلی نہریں، سلامی کے لئے خاموش کھڑے ہوئے

دیو پیکر درختوں کی قطاریں، سروصنوبر کے سبز پوش غلام زادے، بھیڑوں کے گلے، الغوزے

کے تانوں میں مست چرواہے، چکاروں کی ڈاریں، پرندوں کی اڑانوں کی سنسنائیں.....

ہر وہ منظر موجود تھا، ان کے حضور بے گزر رہا تھا جس کی قبولیت کے لئے سلطان اعظم سوار

ہوئے تھے، لیکن گہرے خیالات میں ڈوبی ہوئی آنکھیں صرف ایک صورت دیکھ رہی تھیں

جس کی رفتار نے ایشیا سے یورپ تک کی نصف صدی کی پوری تاریخ پر اپنے نقش پا کی

مہر ثبت کر دی تھیں۔ ان کے سامنے ایلینو رکھڑی تھی۔ سفید زرہ بکتر پہنے، دستانہ پوش

ہاتھ میں عصائے شامی لئے چھل بل کرتے گھوڑے کے پاس ننگے سر کھڑی تھی۔ چاندی کے تاروں کی ایک مہین لٹ پیشانی پر لرز رہی تھی، جیسے تاج میں آویزاں موتیوں کی لڑی۔ حسین دتین آنکھوں میں گھٹنگو کرتی ہوئی، خاموشی سے پھلکتی آنکھوں میں سلطنتوں اور خانوادوں کو زیر و زبر کر ڈالنے والا منصوبہ تیر رہا تھا۔ درباری رقاصاؤں کے بے مثال جسموں کو ترغیب دیتی ہوئی بے جھپک بے قراری کے بجائے ان کے باوقار جسم پر کھانسیوں کی کسی آسودہ اور سنجیدہ ملکہ کی نمکنت برس رہی تھی۔

جب شیردل رچرڈ بیمار ہوئے اور عالم پناہ نے علاج کے لئے شاہی اطباء کو متعین کیا اور یہ خبر یورپ پہنچی تو ملکہ عالیہ رودیں۔ گھٹنوں آپ کی شجاعت اور سخاوت کا ذکر فرماتی رہیں۔ مغرب میں تو یہاں تک مشہور ہو گیا کہ شاہی طبیب کے بھیس میں آپ خود بنفس نفیس تشریف لے گئے تھے اور چارہ گری فرمائی تھی۔

فتح بیت المقدس کی خبر سے سارے یورپ میں زلزلہ آ گیا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے سارے انگلستان کو روٹے ہوئے دیکھا ہے۔ شاہی محل پر ماتمی بادلوں کو رنگتے ہوئے دیکھا ہے، لیکن ملکہ عالیہ کی آنکھیں اسی طرح پرسکون تھیں، اسی طرح مطمئن تھیں..... مراحم خسروانہ سے مالا مال خواتین کا قافلہ جب انگلستان پہنچا تو ملکہ عالیہ نے اسے بطور خاص باریاب کیا۔ کرید کرید کر آپ کی باتیں نکالیں۔ آپ کی صورت، آپ کی سیرت، آپ کے گھوڑے اور آپ کی تلواریں ایک ایک تفصیل حاصل کی۔ ہفتوں اور مہینوں ذکر کرتی رہیں اور اس طرح کہ ہر بار آنکھیں پر نم ہو گئیں، آواز بھر آگئی، نیندیں اچٹ گئیں اور زندگی دشوار ہو گئی۔“

”برادر معظم نائب السلطنت سے شاہزادی جین کی شادی کی تجویز اور تحریک بھی ملکہ عالیہ کے ایما پر کی گئی تھی لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ دنیا کے دو عظیم الشان فرمانروا ایک دوسرے کے دست و بازو دین کر ساری دنیا آپس میں بانٹ لیں۔“

”اگر بیت المقدس کی حرمت درمیان نہ آجاتی تو ہم دعائیں مانگتے اور قدرت کو رضامند کر لیتے۔“

”اس رشتے کا سب سے بڑا فائدہ انگلستان کو پہنچتا۔ کیا اس صورت میں آسٹریا

کی مجال ہو سکتی تھی کہ بادشاہ پر ہاتھ ڈال دے؟“

”ہم نے تم کو اسی مسئلہ خاص پر مشورے کے لئے طلب کیا تھا۔ کیا رچرڈ کی رہائی کی کوئی اور صورت نہیں ہو سکتی؟“

”ہو بھی سکتی ہے لیکن غلام سلطان اعظم سے گزارش کرے گا کہ اسے قبول نہ فرمایا جائے۔“

”کیوں؟“

”ملکہ عالیہ بادشاہ کی گرفتاری سے پریشان ضرور ہیں لیکن وہ یہ بھی جانتی ہے کہ بہر حال رہائی ضرور حاصل ہو جائے گی۔ ان کی گفتگو کے پس پردہ میں نے شدت سے یہ آرزو محسوس کی کہ آپ ایک جرار لشکر کے ساتھ یورپ پر زور فرمائیں۔ آسٹریا اور مشرقی یورپ کو زیر و زبر کرتے ہوئے انگلستان میں جلوس کریں۔ جہاں ایک جشن عام برپا ہو اور ملکہ عالیہ کی آنکھیں آپ کے دیدار سے مشرف ہوں اور ان کی وہ خواہش جو بیت المقدس کی برگزیدہ دیواروں سے نکر کر پاش پاش ہو گئی بیت المقدس کے درمیان آئے بغیر پوری ہو سکے..... عالی جاہا..... ملکہ عالیہ کے مقدس نام کو فراموشیوں نے ناپاک افسانوں سے ملوث کر دیا ہے، اور یہ افسانے جس طرح شہرت پا چکے ہیں اس سے ملکہ عالیہ کو بہت غم پہنچا ہے۔ اب ان کی خواہش ہے کہ جس تلوار کی انھوں نے داد دی ہے اس سے ہریسوں کی بارش ہو اور شکستوں میں شرابور یورپ کی زبان لگ ہو جائے۔“

”تم کو یقین ہے کہ ہمارے لشکر کو روکنے کے لئے سارا یورپ متحدہ ہو کر ہمارے سامنے نہیں کھڑا ہو جائے گا۔“

”سلطان اعظم متحدہ یورپ جتنا بڑا لشکر جمع کر سکتا تھا جمع کر کے بیت المقدس کی بازیابی کے لئے بھیج چکا..... جہاد کے نام پر اٹھ کھڑے ہوئے طوفان کو بیت المقدس کی دیواروں کے نیچے سے ڈھکیل کر بحرہ روم میں غرق کر دینا جس تلوار سے ممکن ہو سکا وہ عالم پناہ کی کمر میں موجود ہے اور جس کا سایہ سارے مغرب میں محسوس کیا جاتا ہے..... اس تلوار کی ہیبت کا اندازہ دمشق میں بیٹھ کر نہیں کیا جاسکتا..... خانہ جنگی کے دلدل میں دھنستا ہوا یورپ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔“

”قحطان!“

”عالم پناہ۔“

”ہم نے ہمیشہ دین کے لئے تلوار نکالی ہے اور گھوڑا اٹھایا ہے۔ کشور کشائی کو یہ شرف کبھی نہیں بخشا گیا۔“

قحطان کی طلاقت لسانی کا ترکش خالی ہو چکا تھا اور سلطان اپنے خیالوں کے پایۂ تخت میں لوٹ چکے تھے جہاں ایلینو عکمر ایں تھی۔

مغرب کے وقت قصر شانی کے روکار کے سامنے میدان میں گھوڑے کے قدم رکھتے ہی سلطان اعظم نے ملاحظہ کیا کہ سارا میدان غبار میں اٹے ہوئے سواروں سے بھرا پڑا ہے اور پھاٹک کے دائیں طرف وہ علم نصب ہے جس کے زرد پھیرے پر سونے کے تاروں کا شیردہاڑ رہا ہے اور اعلان کر رہا ہے کہ نائب السلطنت ملک العادل نے اپنے خدم و خشم کے ساتھ جلوس فرمایا ہے۔ پھاٹک سے نکلتے ہی لائے قد اور مضبوط بدن کے ملک العادل نے لپک کر پیشوائی کی اور رکاب بوسی کے لئے وہ سر جھکا دیا جس کے عمامے کی سریچ کے لئے سات سمندروں نے موتی انتخاب کئے تھے۔ رکاب گیروں کے بڑھتے ہاتھوں کو بامراد کئے بغیر سلطان گھوڑے سے اتر پڑے۔ ملک العادل کے جھکے ہوئے سر کو سینے سے لگایا۔ پشت پر دست شفقت رکھا اور باتیں کرتے ہوئے بارگاہ خاص کی طرف چلے۔



وہ رات غروب ہوتی ہوئی بارہویں صدی عیسوی کی ان راتوں میں سے ایک تھی جو اپنے زمانے کی تاریخ کے نام فرمان جاری کرتی ہے۔ عشاء کی اذان سن کر سو جانے والی نوبت ابھی بیدار تھی۔ قصر دمشق کے شرقی ایوان کی آئینہ بند دیواریں، زریں شمع دانوں اور مریض فانوسوں میں جلتی ہوئی ان گنت شمعوں کی سفید ٹھنڈی روشنیوں کی قبائیں پہنے خاموش کھڑی تھیں۔ وسط میں بچھے ہوئے تخت پر ملک العادل دوزانو بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے رکھی ہوئی کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ ان پر کچھ دیر پہلے بیٹھے ہوئے دیر و سالار اور عالم نائب السلطنت کو فیصلہ کن مشورے دے رہے تھے۔ دروازوں پر بے نیام تلواروں کے پھرے کھڑے تھے اور عادل خیالوں کی دلدل میں گردن تک دھنسنے ہوئے تھے۔ سوچتی ہوئی

نظروں کے سامنے ایک نقشہ کھلا ہوا تھا جس میں مغرب کی سلطنتوں کے علم سرگلوں تھے۔ تخت اوندھے پڑے تھے۔ تاج گھوڑوں کی ٹھوکروں میں لڑھک رہے تھے اور ان سب کے پرے ایک آفتاب شامی قحطان پہنے حقلیہ کا پرانا تاج سر پر رکھے دو لعنتوں کی طرح قدم رکھتا شرماتا ہوا ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نظارے نے ان کے چمپئی چہرے پر سرت کی قلمی کردی۔ سیاہ منچھ سے بھرا ہوا ہونٹ لمبا ہو گیا۔ صحرا کی تاریک راتوں کی طرح سیاہ داڑھی مسکرانے لگی۔ پھر وہ مضبوط گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ دروازے پر کھڑا ہوا تلواروں کا پردہ سرک گیا۔ نورالانوں، روشن غلام گردشوں، مشعلوں کی روشنی میں چشموں کی طرح لہریں لیتے ہوئے سرسبز منھوں، دروازوں کی آنکھیں پر پلکوں کی طرح چھائے ہوئے نیزوں سے گزرتے ہوئے وہ اس جگہ گاتے ہوئے کو شک کے سامنے آگئے جہاں قدم رکھتے ہوئے رات کی سیاہیوں کے پر جلتے تھے اور دن کو ہمیشہ حضوری کا شرف حاصل تھا۔ داخلے پر ”صاحب“ نورالدین والی کیفا کھڑا تھا۔ نائب السلطنت کو دیکھتے ہی پیشوائی کو بڑھا۔



سلطان خلوت خاص میں مسند شامی پر دوزانو بیٹھے تھے۔ ان کے داہنے ہاتھ پر تقی الدین کے برابر ملک العادل تھے۔ بائیں طرف دمشق کے قاضی القضاۃ اپنے ہاتھوں کو ڈھیلی لمبی آستینوں میں چھپائے خاموش بیٹھے تھے۔ ان کے زانو سے تقی الدین کے پہلو تک لال کی صورت میں وہ امراء عظام موجود تھے جو اٹھارہ برس تک سلطان کے گھوڑے سے گھوڑا ملا کر تلواریں چلا چکے تھے اور اب اس طرح ساکت تھے گویا اپنی موت کا حکم سننے آئے ہوں۔ پھر عادل کی آواز بلند ہوئی اور ساری جنگی مجلس چونک پڑی۔

”دین پناہ! غلام عسقلان کے سرحدی قلعوں کی مورچہ بندی میں مصروف تھا۔ جب قحطان نے ملاقات کی، رچرڈ کی گرفتاری کی اطلاع دی، مغرب میں برپا ہونے والی خانہ جنگی کے امکانات پر گفتگو کی۔ خانہ زاد نے سپہ سالار کو پروانہ لکھ کر انتظام مملوکوں کے حوالے کیا اور لشکر خاص کو رکاب میں لے کر باب عالی پر حاضر ہو گیا۔“

سلطان اسی طرح نگاہ نیچی کئے مسند کے زردوز گل بوٹوں کو دیکھا کئے۔ دیر کے بعد نگاہ اٹھائی۔

”تم کو یاد رہا کہ قحطان ہمارا دوست ہے لیکن یہ بھول گئے کہ قحطان عیسائی بھی ہے۔“
عالم پناہ قحطان کی زبان نے صرف ان خبروں کی تائید کی ہے جو آرمینیا اور صقلیہ میں متعین جاسوسوں نے ہمیں بھیجی ہیں اور جن سے سلطان اعظم واقف ہیں۔ بیت المقدس کے دروازوں پر مغرب سے آنے والے زائرین کا روز ایک قافلہ اترتا ہے اور دس دس طرح کی باتوں سے اس ایک بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔“
عادل کے چپ ہوتے ہی نور الدین نے گزارش کی۔

”آرمینیا کے دربار پر شاہ روپن کا بھائی ہملٹن چھایا ہوا ہے جس کی سفارش پر عالم پناہ نے آرمینیا کی خطا بخشی کی تھی۔ اسی ہملٹن کی اجازت کے بغیر فریڈرک باربروسا کی صلیبی فوجیں آرمینیا سے گزری تھیں اور تاج آرمینیا کو ڈنٹیں اور مصیبتیں اٹھانا پڑی تھیں جو اسے یاد ہیں اور جن کا انتقام وہ آسٹریا کی سلطنت سے لینا چاہتا ہے۔ اس بارہ خاص میں احکامات کے لئے آئی ہوئی سفارت دارالحکومت میں داخل ہو چکی ہے اور باریابی کی خواستگار ہے۔“
سلطان نے نگاہ اٹھائی مجلس شوریٰ کے رنگ کا جائزہ لیا۔ دھیمی مگر مضبوط آواز میں فرمایا۔

”تمہاری فتوحات کا راز تمہاری شمشیر زنی میں نہیں تمہاری جوش ایمانی میں پوشیدہ ہے۔ کشور کشائی اور جہان بینی کی ہوس جوش ایمانی کو غارت کر دیتی ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ دین کے نام پر غلاف کی جانے والی تلوار کو دنیا کے نام پر نکالیں اور ایمان کی حرارت کو چند فتوحات کے جشن و جلوس کے ہاتھ بیچ دیں۔“
نقی الدین نے عادل کی نظروں کی شہ پاکر عرض کیا۔

”دین پناہ! اسلامیوں نے ہمیشہ اپنے وطن میں صلیبی لڑائیاں لڑی ہیں اور قہرناک جنگوں کی ناقابل بیان ہلاکتوں کے شکار ہوئے ہیں۔ ہماری صلح پسندی نے لوٹ مار کے عاشق سپاہیوں کو جھوٹے دین کی جھوٹی حرمت کے نام پر ہم آزمائی کا شوق دلایا۔ دین پناہ کی لشکر کشی چوتھی صلیبی لڑائی کو جو دین پناہ کے عہد مبارک ہی میں برپا ہو سکتی ہے، کم سے کم ایک پشت کے لئے نال دے گی۔ مغرب کی نفسیات بدل ڈالے گی اور جارحیت کو مدافعت میں تبدیل کر دے گی۔“

سلطان نے اس عالم دین کو آنکھ بھر کر دیکھا جس کے قلم کی دہلی سے غرناطہ تک اور سر قند سے قاہرہ تک دھوم تھی۔
”آپ خلا میں کیا دیکھ رہے ہیں قاضی اعظم؟“
”دین پناہ..... غلام جو کچھ دیکھ رہا ہے اس کے بیان کی قوت اور جسارت اپنی زبان میں نہیں پاتا۔“
”تاہم۔“

قاضی اعظم نے سیاہ کفتان کی ڈھیلی ڈھالی زردوز آستینوں سے اپنے ہاتھ نکالے اور زانو پر رکھ لئے۔ داہنے ہاتھ کی سیدھی انگلی میں وہ مہر چمک رہی تھی جس کے خوف سے سپہ سالاروں کے خنجر اور زورائے عظام کے قلم لرزتے تھے۔ انھوں نے گردن جھکا کی تو سفید ریشمیں داڑھی کی نوک چمڑے کے کمر بند پر ٹپک گئی۔ مجلس شوریٰ اس طرح بیٹھی تھی جیسے اس کے سر پر آب حیات کے لبریز پیالے رکھے ہوں جن کے چھلک جانے کے ڈر سے سانس تک نہ لے رہی ہو۔ سلطان اعظم کی سوالیہ نگاہیں ان کے پردوار چہرے پر مرکوز تھیں۔ جب سکوت ادب کی حد سے گزرنے لگا تب وہ آواز بلند ہوئی جس نے مسجد کا اقصیٰ میں ایک صدی بعد پہلا خطبہ دیا تھا۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ پوری ایک صدی کے بعد اسلامیوں پر اتاری جانے والی آسمانی رحمت اٹھائی گئی۔ سلطان السلاطین اس منزل میں آسودہ ہو چکے جو بنی نوع انسان کا مقدر ہے۔ تقدیر نے وہ ذوالفقار ثانی نیام کر دی جس کی ہیبت کے سائے میں ملت بیضا حکمت کی نیند سو رہی ہے اور عظیم الشان سلطنت جس پر کسی بھی نمرود کو رشک آسکتا ہے پارہ پارہ ہو چکی ہے۔ مصر، جزیرہ کردستان، حجاز، یمن، شام، افریقہ اور آرمینیا میں الگ الگ حکومتیں قائم ہو چکیں اور کٹوں کی طرح زمین کے ایک ایک ٹکڑے پر لڑ رہی ہیں اور دمشق کے اس مقدس تخت پر کوئی ناپاک سلطان بیٹھا ہے جس کے حضور میں سونے کے پیالے اور چاندی کے بدن قہص کر رہے ہیں اور اسلامیوں کے ساحلوں پر صلیبی جہاز اتر رہے ہیں۔ قلعے شکار اور شہر سہار ہو رہے ہیں۔ مسجد اقصیٰ پر صلیب گاڑ دی گئی اور مسجد عمر میں گھوڑے باندھ دیئے گئے۔

”سلطان اعظم!“

”میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ اسی متبرک کو شک کے اسی مبارک تخت پر نصرائوں کا تخت بادشاہ جلوس فرما رہا ہے اور مجھ جیسے بد نصیب جن کے سینوں سے قرآن نوح لے گئے اور سردوں سے دستار فضیلت چھین لی گئی، مونیوں کی رسیوں میں جکڑے کھڑے ہیں اور آل ایوب کے دردناک انجام پر ماتم کر رہے ہیں اور اس دن کو کوس رہے ہیں جس دن ہم دوبارہ بیت المقدس میں فاتحانہ داخل ہوئے تھے۔“

ان کی آواز پھٹ گئی۔ وہ ہانپنے لگے۔ آنکھوں میں بہتے ہوئے آنسو داڑھی پر لرزنے لگے۔ انھوں نے شملے کا کونا چہرے پر رکھ دیا۔

دیر تک ساری محفل پر خوفناک سکوت طاری رہا۔ سلطان کی سوچتی نیچی نظریں پانداڑ کے نقش و نگار دیکھتی رہیں۔ ان کے ہاتھوں نے پہلو کے تکیے بدل لیے۔ تکیے کا اشارہ پا کر سارا دربار کھڑا ہو گیا اور سوتی آستین سے نکلے ہوئے دراز ہاتھ کو بوسہ دے کر خلوت ”خاص“ سے باہر نکل گیا۔ اب ”خلوت شاہی“ میں عود انوں کی بل کھاتی ہوئی خوشبو اور فانوسوں کی ٹھنڈی سفید تین روشنی کے سوا کوئی اور نہ تھا، لیکن سلطان تنہا بھی نہ تھے۔ چند الفاظ یتیم بچوں کی طرح سینے پر ہاتھ باندھے بے بسی سے ان کا منہ تک رہے تھے۔

اے شجاعوں کے شجاع! ہم تجھ سے تیرا حلیف اور اپنا بیٹا مانگتے ہیں۔

سلطان جنہوں نے اپنے عہد کے ظالم ترین مجرموں پر ترس کھایا..... ان کی جانیں بخشیں اور سلطنتیں داگر اڑکیں..... آج اس طرح منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے کہ انھیں اپنے آپ سے شرم آئی..... پھر نگاہ جھکتی ہوئی شمع پر پڑی..... شمع!..... بجھتی ہوئی شمع! انی اور نو خیز شمعوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ روشن تھی۔ اس خیال کے آتے ہی قحطان کے الفاظ کی قباہن کر ایلیو ران کے سامنے آ گئی۔

وہ سر سے پاؤں تک سیاہ پوش تھی۔ بر میں سیاہ زربفت کا لباس تھا۔ سر پر سیاہ سونے کا تاج تھا۔ گلے میں سیاہ ہیرے کی صلیب تھی اور آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ پاؤں کانپ رہے تھے اور ہونٹ لرز رہے تھے۔ سلطان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور ناقابل بیان نجل اور تجس کے ساتھ گھٹنوں پر گر گئی اور عبائے سلطانی کا دامن پکڑ کر درخواست کی۔

”یہ دشلم کے فاتح مجھے میرا بیٹا عطا ہو۔“

بادشاہوں کے بادشاہ نے آنکھیں بند کر لیں اور سامنے کے مرمریں درہچے کی مینی دہلیز پر دونوں ہاتھ ٹیک کر کھڑے ہو گئے، کھڑے رہے۔ پھر دیوار گیری پر رکھے ہوئے سنہرے پھولدان میں اترے ہوئے گلاب پر نظر پڑ گئی۔ گلاب مرجھا کر حسین اور جان لیوا ہو گیا تھا۔ انھوں نے اُسے چپکے سے اٹھالیا۔ اس کی خشک ملائم تھلیں پتیاں ان کی ہتھیلی پر بکھر گئیں جیسے خود ایلیو ر کے بالوں کی خوشبو زندہ ہو گئی..... اور ان کا ہاتھ بے ساختہ تلواریں کے قبضے پر چلا گیا۔ پھر تخیل کی آنکھوں نے دیکھا کہ فضا پر سرئی دھند چھائی ہوئی ہے اور برقی ہواؤں کے جھکڑ نیزوں کی طرح جسم کو چھیدے ڈال رہے ہیں۔ جدنگاہ تک پتھر لیے میدان میں کئے ہوئے ہاتھ پیروں اور سردوں کے کھلیاں لگے ہیں۔ ٹوٹی ہوئی ڈانڈوں اور چھتھڑوں کی طرح اڑتے ہوئے پھریروں کے پاس چیلوں، کوؤں اور گدھوں کے جھنڈ چروں سے آنکھیں کرکول رہے ہیں، ہاتھ پیروں سے گوشت نوح رہے ہیں۔ بھیڑیوں اور گیدڑوں کے غول اپنے منہ میں لاشوں کے شکار دبانے دھیمی رفتار سے گھسیٹتے پھر رہے ہیں اور وہ اس بھیانک منظر کو دیکھتا ہوا اپنے طلیل الشان امیروں کے جلو میں گزر رہا ہے..... پھر ترقی الدین نے اس کی رکاب کا بوسہ دیا اور ہاتھ کا اشارہ کیا۔ سامنے متحدہ یورپ کا مفتوحہ لشکر کھڑا تھا۔ پہلے لمبے چروں، زرد چھوٹی آنکھوں، بڑھے ہوئے ناخنوں اور اڑتی ہوئی داڑھیوں پر وحشت برس رہی تھی۔ نہ کہیں جھنڈے، نہ بیرقیں، نہ صفیں نہ مورچے، لاچار اور مجبور انسانوں کا انہوہ جنگل سے لائی ہوئی سوخنے لکڑی کے کندوں کی طرح ڈھیر تھا۔ سب کی جسم مانگتی آنکھوں میں زندگی اور پیٹ کی یکساں بھوک تڑپ رہی تھی۔ وہ ان کی طرف نگاہ کئے بغیر آگے بڑھ گیا..... اب مفتوحہ شہر کی شہر پناہ پراڑے ہوئے ایوبی پرچم نظر آنے لگے۔ دیواروں سے لگی ہوئی منجیقوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی قطار کے نیچے نائب السلطنت ملک العادل اپنا فاتح لشکر لئے کھڑے ہیں جن کے دھندلائے ہوئے چہروں پر فتح کی مسرت کے نقوش کے بجائے تھکن کے آثار دور سے پڑھے جاسکتے ہیں۔ شہر کے کنکر لیے راستوں کے دونوں طرف ایوبی منجیقوں کے اگلے ہوئے پتھر ڈھیر تھے۔ فتح سے جلی ہوئی سرخ و سفید عمارتیں دھوئیں سے چسکبری ہو گئی تھیں۔ ان کے ٹوٹے ہوئے رومی درہچے خردہ دیدوں کی طرح

کھلے پڑے ہیں۔ پتھروں کی مار سے شکستہ دیواریں غنیم کی شکست خوردہ فوجوں کی طرح کھڑی تھیں۔ بازنطینی برجوں اور شہر نشینوں پر اسلامی نشان اُڑ رہے ہیں۔ اونچے اونچے سنگین دروازوں کے اچلے فرش انسانی خون سے گندے پڑے ہیں۔ جلتے ہوئے عکلوں کی چھتوں پر دھواں سیاہ ماتمی جھنڈوں کے مانند لہرا رہا ہے۔ سارا شہر متعفن ہے۔ اب گو تھک طرز تعمیر کی وہ عظیم الشان عمارت آگئی جو کبھی ”سینٹیک“ کے تاجداروں کا مرکز ہوا کرتی تھی۔ گول بھاری ستونوں کے نیچے تاج الملوک اور ملک الافضل اس کے محافظ دتے کو اپنی کمان میں لئے کھڑے ہیں۔ سنگ مرمر کے زینوں پر انسانی خون کا قالین بچھا ہوا ہے اور آخری سیڑھی پر ایلینو رکھڑی ہے اور خوش آمدید کہہ رہی ہے۔ اس نے اترنے کے لئے رکاب سے پاؤں نکالا کہ کسی نے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

صلاح الدین!

کیا اسی منحوس دن کے دیدار کے لئے تو نے اپنے جسم پر مقدس کفن پہنا تھا، اس پلید گھڑی کے طلوع کی خاطر بیت المقدس کے متبرک سائے میں قسم کھائی تھی۔ سفید ڈھلے گوشت اور مٹھی بھر کر درہڈیوں کے ڈھیر کی خاطر لاکھوں انسانوں کے بے گناہ خون کا سودا منظور کیا گیا؟ روئے زمین کی جلیل المرتبت سلطنتوں کو سولی پر چڑھا دیئے کا حکم نافذ کیا گیا؟ انسانوں سے چھلکتے ہوئے ہزاروں شہروں کو خاک کا پیوند کر دیا گیا؟ ان گنت عورتوں کو بیوہ، بے حساب بچوں کو یتیم اور لاتعداد بوڑھوں کو بے آسرا کر دینا گوارا کیا گیا؟ لیکن ہم تو بیت المقدس کے.....

تحفظ کے لئے آئے ہیں!!..... خوب! تو ہمارا مشورہ ہے کہ بیت المقدس کی آئندہ حفاظت کے لئے آج کی ساری عیسائی آبادی کو تہ تیغ کر دے۔ اس اندیشے سے خائف ہو کر کل اسلامیوں کو شکست کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔ تثلیث کا نام و نشان منادے۔ بوڑھے سلطان ایلینو جیسی ہزار ہا عورتیں مصر کے وزارت عظمیٰ کے تخت کے سامنے حاضر رہا کرتی تھیں۔ کاش تو نے اس دن اپنی ہوس پوری کر لی ہوتی تو آج دنیا تیری تلوار کے عذاب سے محفوظ رہتی۔

”رچڑ؟“

”رچڑ کی رہائی کے لئے تیری ایک سفارت کافی تھی جس کی روانگی پر تو نے کبھی سنجیدگی سے غور کرنا پسند نہ کیا۔ لیکن مجلس شوریٰ؟“

”بوڑھے اور بیمار سلطان! تو ساری دنیا کو فریب دے سکتا ہے لیکن اپنے آپ کو نہیں۔ کل موت و حیات کی کشمکش میں جس قوم نے تیرے حکم کو مشیت ایزدی کی طرح قبول کر لیا آج اس کے زمانے میں وہ سرتابی کی مجال کر سکتی ہے؟“

”تو نے زندگی بھر جس رحمت و شجاعت کا اظہار کیا وہ بکر و فریب کے طلسمی لہادے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ تیری تمام سخاوتیں، عبادتیں اور ریاضتیں ایک ڈھکوسلہ تھیں جن کا بھرم آج کھل گیا۔ تیری مثال اس بیوقوف گنہگار کی سی ہے جس نے جوانی کی شیریں راتوں کی نیندیں بیچ کر پیسہ پیسہ کمایا۔ ایک ایک پیسے کو دانت سے پکڑ کر جمع کیا اور مرتے مرتے جوئے کے ایک ہی داؤں میں ہار گیا..... جا، تاریخ اپنی فہرست میں ایک اور فرعون، ایک اور فاتح ایک اور غاصب کا نام لکھ لے گی۔“

”لیکن.....“

”بیت المقدس تیری تلوار کا صلہ نہیں خدا کی رحمت کا ثمر ہے۔ اس خدا کی رحمت پر بھروسہ رکھ جس نے تجھے بادشاہوں کی بادشاہی عطا کی ہے اور رشتہ اسکان میں پر چھائیوں کے شکار کے لئے اپنی اور اپنے سپاہیوں کی جان ہلاکت میں نہ ڈال۔“

”بیمار شہنشاہ!“

”اپنی سلطنت کو..... اپنے ممالک محروسہ کو عدل سے بھروسے، راستوں کی حفاظت اور تجارت کو فروغ دے۔ نہروں کو لبریز اور کھیتوں کو شاداب کر۔ ساہا سال کی لڑائیوں سے زخمی دلوں کو طمانیت اور تسکین عطا کر۔ اب تجھے بھوک، بیماری، ظلم اور جہالت کے خلاف جہاد کرنا ہے کہ یہی جہاد اکبر ہے۔ ملکوں کو حاصل کر لینے کا نام فتح ہے اور ملکوں کو آباد کرنا اور آبادیوں کو عدل سے بھر دینا فتح الفتوح ہے۔ یاد رکھ! قیامت کے دن تیری رعیت کا ایک حقیر چرواہا اپنی کھوئی ہوئی بکری کے لئے تیرا گریبان پکڑ لے گا اور عدل وصول کرے گا۔“

اپنے زمانے کی سب سے بڑی سلطنت کا مطلق العنان حاکم، اپنی دنیا کا سب

سے بڑا فاتح دیر تک اسی طرح ساکت و صامت کھڑا رہا۔

وہ اسلامی تاریخ کا عجیب و غریب زمانہ تھا۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے مقدس سروں سے دستار حکومت اتر چکی تھی۔ بغداد ایک میوزیم کی طرح زندہ تھا جس کے در و دیوار بنو عباس کی عظمت رفتہ کے سرخیے پڑھ رہے تھے اور عالم اسلام عقیدت سے سر جھکائے سن رہا تھا۔ قاہرہ تخت دمشق کا ایک پایہ تھا۔ غرناطہ اور قرطبہ اس تلوار کی طرح علم تھے جس کے قبضے پر جواہرات جڑے ہوں لیکن جو ہر مر گئے ہوں۔ سمرقند کے بازوؤں میں وہ طاقت نہ تھی جو تاریخ عالم کا رخ موڑ دیا کرتی ہے۔ دہلی مرکز سے دور اور طوفانوں سے بے نیاز غلیبوں کے تاج کے لئے موتی فراہم کر رہا تھا اور عالم اسلام کا سب سے بڑا اور روئے زمین کا سب سے مغرور شہر دمشق..... ایوبی پرچم کی چھاؤں میں ایک فاتح کی طرح کھڑا ہوا ملت بیضا کے خزانوں کی حفاظت کر رہا تھا۔

مسلمان نان جویں اور بازوئے حیدر کا تعلق فراموش کر چکے تھے۔ عبدالملک اور ہارون رشید کے سنہرے دن بیت چکے تھے لیکن ایک ایک زبان کو ان کی کہانیاں یاد تھیں۔ ایک ایک آنکھ میں وہ مناظر آباد تھے جن میں دنیا کے مقہور بادشاہوں کو بیڑیاں پہنائی گئی تھیں۔ پھر مغرب کا صلیبی جولا کبھی فلسطین کی شہر پناہ سے اتر کر بلاد اسلامیہ کو خاک و خون میں نہلاتا بڑھائی تھا کہ صلاح الدین ایک پشتی بان کی طرح کھڑا ہو گیا اور اس کی آتش فشاں کو اپنی تلوار کے پانی سے بجھا کر ڈال دیا اور مشرق کا کھویا ہوا غرور لا کر ایک بار پھر مسلمانوں کے غماصوں میں ٹانگ دیا۔ اس طرح وہ عشرت گاہیں محفوظ ہو گئیں جن کو نصف صدی بعد چنگیزی طوفان کا خس و خاشاک بنا مقدر ہو چکا تھا۔

دنیا کے عیش جن درختوں میں پھلتے تھے وہ عالم اسلام کے بچے بچے پر سر سبز تھے۔ دمشق کی پتھریلی گلیوں میں مٹلیں کاٹھیوں اور روہیلی رکابوں سے آراستہ گھوڑوں پر سوار مسلمان گزر رہے تھے۔ ان پر اعتماد آنکھوں، روشن پیشانیوں اور شادماں چہروں پر زندگی سے آسودہ طمانیت برس رہی تھی۔ بھاری عماموں پر عقاب کے پردوں اور موتیوں کی کلفیوں کی روشنی تھی۔ کفتانوں کے دامنوں، آستینوں اور شمسوں پر سونے کے تاروں کی زرکاریاں تھیں۔ نفاست سے ترشی ہوئی داڑھیاں، بے نظیر تراشوں کی قبائیں، جواہر سے

گوندھے ہوئے قبضوں کی تیغیں اور خنجر اور نیچے موج در موج رداں تھے۔ سدھے ہوئے باز، عقاب اور شکرے ان کے ہاتھوں پر زیوروں کی طرح سجے رہتے۔ شکاری چیتے اور کتے بے زبان غلاموں کی طرح ان کی سواری کے پیچھے دوڑا کرتے۔ چھتے دار بازاروں میں چین اور ہندوستان، افریقہ اور یورپ کی مصنوعات اور نوادرات بھرے رہتے۔ زہرہ و ناہید کو شرمائے والی ہر نسل اور ہر رنگ کی کنیزوں کا جھوم کھڑا ہوتا۔ محلوں کے روکاروں اور مکانوں کی ڈیوڑھیوں پر غلاموں اور گھوڑوں کے گلے چیتے اور چہناتے ہوتے۔ دروازوں پر ملک ملک کی صنعت کے نمائندہ پردے بڑی تمکنت کے ساتھ کھڑے رہتے۔ بیش قیمت قالین اپنے آقاؤں کے مبارک قدموں کے لمس کی دعا مانگا کرتے۔ رو پہلے حاشیوں اور سنہرے فانوسوں کے زیور پہنے لمبی چوڑی چھتیں اپنا سرد گرم سایہ لئے ان تجاہل پیشہ مکینوں کی راہ نکا کرتیں جو گھوڑوں کو رانوں میں دبائے، کھنچی ہوئی کمانوں میں تیر جوڑے گھنے کالے جنگلوں میں گور خری جستجو کیا کرتے۔ بیش بہا ہتھیاروں اور بیش قیمت نعمتوں سے بھرے ہوئے طاقتوں سے لدی پھندی دیواریں ان کے انتظار میں کھڑی سوکھا کرتیں جو پائیں باغ کی دہلی پتلی نہروں اور مونے تازے حوضوں کے کنارے سرخ گلاب کے کنجوں کے آس پاس چاند سورج جیسی عورتوں کو پہلو میں لئے نہلا کرتے۔

لہلہاتی گھائیوں میں شاداب قصبے تھے جن کے سامنے کھجوروں، سیبوں، انگوروں، خوبانیوں، شہوتوں اور ناشپاتیوں کا دسترخوان بچھا رہتا۔ چکلیے ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشموں کے کٹورے رکھے رہتے۔ مکانوں کی پگڑیوں پر باد پرچی خانے کے دھوکے کے سرخی طرے لرزا کرتے۔ کچے پکے مکانوں کی سنگین چوبیس اور کھجور کی چھال کی چھتوں کے نیچے لائے چوڑے دالانوں میں سوت کاتنی، قالین بنتی، چڑا رنگی اور مٹی کے برتن بناتی کسان بوڑھیاں کھانسی راتیں، کھنکارتی راتیں، شریر پوتوں، نواسوں کو چکاری پھسلاتی راتیں۔ بوڑھے لوٹی ہوئی مغربی قبائیں پہنے باغوں اور کھیتوں کی فصلوں کو آسکتے رہتے۔ ردیلے جوڑوں اور تمنوں کی طرح گلے ہوئے زخموں اور دافنوں کو سہلاتے رہتے اور زہن میں کلبلا تے ہوئے گناہوں کو جہاد کی یلغاروں کا نشہ پلا کر تھکیاں دیتے رہتے اور سورجورہ خست کی حوروں سے انگلیوں کے خواب دیکھا کرتے۔ عورتیں خیالی آنکھوں سے دمشق کے بازاروں میں

کوڑیوں کے مول بکئی ہوئی مصنوعات اور زیورات کو پسند کیا کرتیں۔ مٹی کے بیضاوی گھڑوں میں چشموں کا پانی بھرا کرتیں اور خوشبودار راستوں پر چلتی ہوئی ان دنوں کو یاد کیا کرتیں جب ان کے شوہران کو گھوڑے کے لئے ان جھاڑیوں میں سنڈ لایا کرتے تھے جو آج مال غنیمت میں آئی ہوئی مغربی کینروں کی لذت میں کھوئے رہتے ہیں اور مرد ڈھیلے ڈھالے کفتان پہنے، آبدار ہتھیار باندھے، طرحدار گھوڑوں پر سوار ان عورتوں کی تیز خوشبو یاد کیا کرتے جو انھیں لوٹ میں ملی تھیں اور جنھیں بیچ کر انھوں نے گھوڑیاں خریدی تھیں اور کھیت بوئے تھے۔



غروب ہوتی ہوئی سردیوں کا شامی آفتاب جب ایک نیزہ بلند ہو یا تب قبہ نشاہی کی چلی منزل کی درمیانی محراب کے ہشت پہل زر کارستون سے لگے کھڑے ہوئے وزیر ابو بکر کے پاس امیر سامان پہنچا اور جلوس کے تیار ہونے کی خبر دی۔ وزیر نے مرصع کمر بند کو کس لیا۔ دونوں ہاتھوں سے عمامے کا زادیہ درست کیا۔ زینے پر کھڑے ہوئے قراوقش کے محافظ دستے نے اپنے جگمگاتے ہتھیاروں کو سمیٹ کر وزیر کے لئے راستہ بنا دیا اور وہ سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ ترکمان سردار نے بھاری پردہ ہٹا دیا۔ سلطان اعظم تخت کے نیچے سے پشت لگائے دونوں ہاتھوں سے سردبائے نیم دراز تھے۔ وزیر نے پائنتی کھڑے ہو کر سینے پر ہاتھ باندھ لئے۔ سلطان نے ابرو پیشانی پر چڑھائے اور سوچتی نگاہ سے سوال کیا۔ وزیر نے سر جھکا لیا پھر تن کر کھڑے ہو کر گوش گزار کیا۔

”حکم تھا کہ حاجیوں کے قافلے کی پیشوائی سلطان السلاطین بنفس نفیس فرمائیں گے اس لئے قافلے کو ”باب الشرق“ پر روک دیا گیا ہے اور فرمان ثانی کا انتظار ہے۔“

سلطان کے اٹھتے ہی وزیر اگلے قدموں واپس چلا گیا۔ امیر بیوات نے غلوت شامی کے مغربی دروازے کا پردہ ہٹا دیا۔ سلطان تخت کے پاس ہی کھڑے رہے پھر خود گلانی کے سے انداز میں گویا ہوئے۔

”بوڑھے اور بیمار جسم کو بادشاہی تکلفات زیب نہیں دیتے۔ لاؤ جب پہنا دو۔“
امیر نے زرد ریشم کا جبہ پہنا دیا۔ ایک غلام نے مرصع دستا نے پیش کئے جو نامقبول ہوئے۔ کمر میں امیر نے وہ کمر بند باندھ دیا جو پیکھر ارج کے کام سے زرد تھا۔ پورے احترام

کے ساتھ وہ تلوار کمر میں لگا دی جسے ذوالفقار ثانی کا جائز خطاب دیا گیا تھا۔ ابھی غلاموں کی انگلیاں پیرہن پر لرز رہی تھیں کہ ان کے قدم دروازے کی طرف اٹھ گئے۔ زینے پر کھڑے ہوئے چاؤش نے امراء کو اطلاع دی۔

اندرونی عمارت سے چبوترے کی سیڑھیوں تک شہزادوں، وزیروں اور سرداروں کا موزب ہجوم کھڑا تھا۔ سلطان آداب شامی کی بجائے آوری سے بے نیاز چبوترے کی آخری سیڑھی تک پہنچ گئے۔ سامنے ”طاؤس زرّیں“ نام کا زرد خالص عربی گھوڑا کر دھام براداروں اور ترکمان تیرداروں کے حلقے میں کھڑا تھا۔ رکاب میں پائے مبارک رکھتے ہی دور باب الداخلہ سے طبل بجنے کی آواز آنے لگی۔ مرکب شامی کے آگے کھڑے ہوئے چار حسین، ہند رست اور نوخیز غلام پرندوں کی طرح اڑ کر اپنے سفید گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ ان کی آستینیں دداس اور شمسے زرکار تھے۔ پگڑیاں زرد اطلس کی تھیں، ہتھیار اور گھوڑوں کے ساز مرصع تھے۔ ان کے داہنے ہاتھ میں ”کفیہ“ (رومال) تھے۔ ان کے سوار ہوتے ہی شاہزادہ طغرل نے سلطان پر چھتر شامی کا سایہ کر دیا۔ طاؤس زرّیں جو ابھر نگار چار جامہ پہنے، آبدار موتیوں کی کلفتی لگائے غرور سے پاؤں پک رہا تھا اور سلطان آنکھوں کے گوشوں سے اراکین سلطنت اور امراء دولت کو ملاحظہ فرما رہے تھے۔ ممالک افریقہ کا نو جوان امیر غنفر جس نے جہاد میں بڑے بڑے معرکے انجام دیئے تھے اس خدمت خاص پر متعین تھا کہ مرکب شہنشاہی کا چار جامہ پکڑ کر چلے۔ وہ سنگ سیاہ کے دیو کی طرح طاؤس زرّیں کے ساتھ ساتھ گھوم رہا تھا۔ مزاج داں امیر نے نگاہ سلطانی پڑھ لی اور گزارش کی۔

”مصر اور کردستان سے آئے ہوئے لشکر مضافات میں مقیم ہیں۔ نائب السلطنت

اور سپہ سالار دولت ملاحظے کے لئے تشریف لے گئے ہیں۔“

اس پہاڑ کی طرح بھاری بھر کم امیر کی الغوزے کی سی نسائی شیریں آواز نے سلطان کو ہمیشہ محفوظ کیا تھا۔ اس وقت بھی ان کے سنجیدہ لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور انھوں نے آستین سے رومال کھینچ لیا۔ یہ اشارہ تھا جلوس کی روانگی کا، چشم زدن میں راکب و مرکب ایک ہو گئے۔ امیر جلوس وزیر ابو بکر نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ باب الداخلہ پر کھڑی ہوئی اونٹوں کی قطار طبل بجاتی ہوئی چلی اور حجاز و مصر کے امیر اپنے اپنے نشان

اڑاتے، شمشیر زادوں کو رکاب میں لئے چل رہے تھے۔ ان کے بعد ایک شخص نفیری بجاتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ سفید گھوڑوں پر سوار چار غلام قدم سے قدم ملائے آگے بڑھ رہے تھے۔ مرکب شاہی کے پیچھے طغرل کے آہنی ہاتھ میں وہ بھاری چھتہ تھا جس پر بیٹھا ہوا سونے کا عقاب اڑنے کے لئے پرتول رہا تھا۔ جب سواری باب الداخلہ سے گزر گئی تب محن میں بھرے ہوئے سوار شہزادوں، امیروں اور وزیروں کے ساتھ جلوس کے پیچھے ہوئے۔

اب دمشق کے قدیم محلات کے نکیلے میناروں کی چھتیاں اور خرطی گنبدوں کے کلس نظر آنے لگے تھے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے یہ شاہانہ عمارتیں پورے محل کے ساتھ پیشوائی کے لئے آگے بڑھ رہی ہوں۔ قصر سلطانی کے میدانوں اور باغات کے حدود ختم ہوتے ہی جلوس انسانوں کے لہریں لیتے ہوئے دریائے دجلہ میں داخل ہو گیا۔ مغرور اور دولت مند دمشق کی خوش حال آبادی محافظ اسلام کے ایک مقدس دیدار کے لئے صبح سے شہر اہ عام کے دونوں طرف اہل پڑی تھی۔ سرخ پتھر کی سطح سڑک کے دونوں طرف زمین کا ایک ایک چپہ انسانوں سے بنا پڑا تھا۔ دکانوں کے سنگین دالان، چوبیس اور چر میں سائبان، فلک بوس ڈیوڑھیوں کے تاریک حجرے، نیم تاریک محرابیں اور محلوں و مسجدوں کی سیڑھیاں بوڑھیوں، جوانوں اور بچوں سے چھلک رہی تھیں۔ بوڑھے غازی اور جوان شاعر و موسیقار اپنے اپنے مداحوں کو ٹولیوں میں کھڑے پڑوسر آواز اور بڑبڑاؤش الفاظ میں حطین اور فلسطین کی لڑائیوں کے قصیدے سنارہے تھے اور گارہے تھے۔ جب مرکب شاہی ان کے قریب سے گزرتا تو وہ خود فراموش آواز میں سلطان کی عمر و اقبال کو دعائیں دیتے، نعرے لگاتے اور رکاب بوسی کا شرف پانے کے لئے یلغار کر دیتے اور مستعد سوار اپنے گھوڑے بیچ میں ڈال کر انھیں دور رکھنے کی کوشش کرتے اور یہ بھی ہوتا کہ کوئی بوڑھا مجاہد یا نو عمر لاکا پانی عمر کا فائدہ اٹھا کر محافظ دستے کے حلقے کو توڑ کر گھسی آتا اور امیر افریقہ، غففر کی سرخ ہوشیار مودب آنکھوں کے سامنے طاؤس زریں کی رکاب پر سر رکھ دیتا اور پاپوش سلطانی کو اپنے آنسوؤں سے بھگو دیتا اور جب غلام چاہتے کہ ان کی کمر میں کوڑا ڈال کر اٹھالیں تو ایک جبین انھیں اس حرکت ناشائستہ سے منع کر دیتی اور جب جلوس گزرتا تو پتہ چلتا کہ کتنے ہی آدمی دم گھٹنے سے بیہوش ہو گئے اور کتنے ہی گھوڑوں سے کچلے گئے۔ ان پر گلاب چھڑکا جاتا، نلخہ سنگھایا جاتا اور دمشق کے کئی

درجن شفا خانوں کے سینکڑوں طبیب ان کے علاج کے لئے دوڑ پڑتے۔ بازار زردوزی کے چھتے سے نکلتے ہی بوندیں پڑنے لگیں۔ وہ بارش ہونے لگی جو فھلوں کی بالیوں کو مضبوط کرتی ہے اور دانے کو دونا کرتی ہے۔ آبادی اس بارش رحمت کو دیدار شاہی کا فضل سمجھ کر دعائیں دینے لگی۔ تلواروں اور تیروں کی یورش میں ثابت قدم رہنے والی زندہ قوم اسی طرح کھڑی رہی۔ سفید، سرخ اور زرد پتھر کی عمارتوں کے سنگین چھتوں اور کامدار و جالی دار شہ نشینوں کی چلمنوں کے پیچھے کھڑی ہوئی شعلہ بدن عورتوں اور گل بیرکن بچوں کے ہاتھوں سے پھول برستے رہے۔ طغرل نے چھتر شاہی کو نیچے کر کے جسم سلطانی کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ امیر جلوس وزیر ابو بکر نے گھوڑے بڑھانے کی اجازت مانگی جو نصیب نہ ہو سکی۔ حاجیوں کے قافلے تک پہنچتے پہنچتے سلطانی کفتان کے دامنوں سے بوندیں ٹپکنے لگیں۔ بھیگے ہوئے لباس پر طوفانی ہواؤں کے جھکڑ اور تکلیف دہ ہو گئے۔ جب ایک حاجی کو مصافحہ کی سعادت بخش چکے اور سارے جسم میں تھر تھری ریگ گئی تو اپنے آپ پر قابو فرمایا اور داہنی رکاب کے پاس کھڑے ہوئے وزیر کی طرف خفیف سا ٹھک گئے۔ وزیر نے اپنا کان پیش کر دیا۔

”مقررہ راستے کو نظر انداز کر کے جلد از جلد قصر پہنچنے کی کوشش کرو۔“

وزیر نے پشت پر کھڑے ہوئے غلاموں کے کان میں کچھ کہا اور ٹیل کو بجوایا۔ شاہراہوں پر کھڑی ہوئی آبادی جلوس کا انتظار کرتی رہی اور جلوس شہر پناہ کے نیچے اڑتا ہوا قصر کے ”باب الداخلہ“ میں داخل ہو گیا۔

خلوت شاہی کے دروازوں اور درجیوں پر پردے ڈال دیئے گئے۔ دیکھتے ہوئے کوکلوں کی سیمیں انگلیٹھیاں لگادی گئیں اور سلطان نے سمور کے کفتان پر بخارا کے پشمینے کی چادر اوڑھ لی۔ ملک الاطباء حاضر ہوئے۔ نبض چھوئی، انگلیاں جل گئیں مگر اپنے جذبات پر قابو اور چہرے پر طمانیت کی حقیقت کے نبض دیکھتے رہے۔ غلاموں کے ہاتھوں پر رکھی ہوئی دواؤں کی کشتیوں سے ایک خوراک بنائی اور اپنے ہاتھ سے شیشہ پیش کیا۔ سلطان دوا پیتے رہے اور وہ خدائے بزرگ دیر تر سے صحت کی دعا مانگتے رہے۔



تیم کیا، مغرب کی نماز بیٹھے بیٹھے ادا کی لیکن چہرے سے کسی تشویش یا فاقہت کا

اظہار نہ ہونے دیا۔ الہکاری جن کے ہاتھ میں قلمدان جہاد رہتا تھا حسب معمول پیشی کے لئے حاضر ہوئے۔ طیب شاہی نے چاہا کہ ان کو اشارے کنارے سے حالتِ سلطانی کا علم کرادیا جائے لیکن رازداری کے خوف سے خاموش رہے۔ نگاہ ملتے ہی وزیر نے استدعا کی۔
”والیائے حکومت کے نام جاری کئے گئے فراہم مہر شاہی کے ثبت ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔“

سلطان اعظم کے ارشادِ عالی سے قبل ہی طیب خاص نے دھمی آواز اور مضبوط لہجے میں کہا۔

”طیب کی حیثیت سے میری وزیر جہاد سے گزارش ہے کہ اس وقت سلطان المسلمین کو آرام کی شدید ضرورت ہے۔“
الہکاری کے ابرو پیشانی پر چلے گئے اور آنکھیں پھیل گئیں۔



صلیبیوں سے جہاد کے منصوبے میں بیت المقدس کے سامنے فیصلہ کن لڑائی شامل تھی جسے صلیبوں کی قبل از وقت اور نامراد واپسی نے انجام پذیر نہ ہونے دیا۔ یوں تو منصوبے کی ایک ایک شق کا سلطان بنفس نفیس علم رکھتے تھے لیکن جو عظیم الشان کام درپیش تھا اس کی کامیاب بجا آوری کے لئے مختلف مہمات مختلف ہاتھوں میں سونپ دی گئی تھیں۔ نائب السلطنت ملک العادل سامان جنگ کے شعبے میں مہتمم اعلیٰ تھے اور وزیر ابو بکر رسد کے ذمہ دار۔

حقلیہ میں متعین اسلامی جاسوسوں کی خبریں وصول کرتے ہی عادل نے اپنے قیام کو طویل دے کر سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اسلامی سپاہ کی نفسیات کے قباضہ جزل نے اپنی آنکھوں سے صلیبوں کی بدحواس پسائی دیکھی تھی۔ سلطان السلاطین کے بھائی دست راست اور اپنے عہد کے سب سے بڑے مدبر کو ”محافظ اسلام“ کا جو اعتبار حاصل تھا اس کی یاد سے حافظہ لبریز تھا۔ انھوں نے نائب السلطنت کی حیثیت سے پہ سالار تقی الدین اور وزیر جہاد ابو بکر کا اعتماد حاصل کیا اور اپنا خفیہ منصوبہ کھول کر رکھ دیا۔ جب گرجاشی کے ساتھ طاقت حاصل کر لی تب جنگی کے راستے سے آئے ہوئے جرمن صلیبیوں کے آسان راستے

کا انتخاب کیا۔ بیت المقدس سے دمشق اور قاہرہ تک پھیلے ہوئے تمام قلعوں، مورچوں، شہروں اور بستیوں میں بے حساب آلاتِ حرب اور سامانِ رسد بھرا پڑا تھا۔ ایک لاکھ جنگی گھوڑا اور پچاس ہزار خچر تیار کھڑا تھا۔ قاصدوں کے ذریعہ قلعہ داروں، والیوں اور عالموں کو احکام بھیجے گئے کہ وہ دن میں قیام کرتے اور رات میں طوفانی رفتار سے سفر کرتے ہوئے چلیں اور ایک ایک کمان، ایک ایک تیر اور ایک ایک تحقیق کو ”رکاب“ سے اٹھا کیے تک انتظار کرتے ہوئے قلعوں میں پہنچادیں۔ پورا رسد خانہ اور توشہ خانہ جنگی گھوڑوں، خچروں اور اذخروں پر لاد کر روانہ کردیں۔ ابھی ان احکامات کی تعمیل ہو رہی تھی کہ قطان نے پروانہ رابداری حاصل کرنے کے لئے ملاقات کی اور سفارت کاران کے کان میں ڈال دیا۔ قطان کی روانگی کے ساتھ ہی انتظامات کی رفتار اور تیز کر دی گئی۔ پھر سوڈان، مصر، حجاز، یمن اور کردستان کی مستقل تنخواہ دار فوجوں کے بڑے حصے کو دار السلطنت میں حاضر ہونے کا فرمان لکھا اور خود دمشق کے لئے سوار ہو گئے۔ تقی الدین پہلے ہی اپنے خاص رسالوں کے ساتھ جنبش کر چکا تھا اور راستے کے قلعوں میں بیکار پڑی ہوئی سپاہ کو سہینٹا ہوا باب حکومت کی طرف باگیں اٹھا چکا تھا۔

خلوتِ شاہی میں قاضی القضاۃ کی دردناک تقریر پر سلطان المسلمین کی خاموشی نے عادل کو مغربی یلغار پر شاہی رضامندی کا یقین دلادیا تھا۔ دربارِ خاص سے نکلنے ہی نائب السلطنت نے سنگین خفیہ احکامات جاری کر دیے۔ ایک عظیم الشان سلطنت کی مضبوط ترین حکومت کے بے پناہ وسائل حرکت میں آ گئے۔ حکمہ ذاک کے سرگھوڑوں اور نیلے کبوتروں سے زمین و آسمان بھر گئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے دریائے زرفشاں (رود بردہ) کے دونوں کناروں پر اونٹوں اور بھیڑوں کے بالوں کے خیمے، تلکا رندے کی بارگاہیں، حریر و پٹیل کے سراپردے، اونٹنی اور ریشمیں قاتیں اور چمڑے کی چھو لدریاں کھڑی ہو گئیں۔ مدد، مکعب اور مستطیل بارگاہوں پر مصری، سوڈانی، حجازی، یمنی اور کردستانی امیروں کے زرد، سرخ، سبز نیلے اور سیاہ بھیریوں پر زردوزی ذاتی نشان لہرانے لگے۔ سپاہیوں کے ساتھ آئے ہوئے کوئل گھوڑوں، سامان کے خچروں اور اونٹوں سے سرسئی جنگلوں کے دمریان بچھے ہوئے سبز پوش قطعے طویلے بن

گئے۔ دست کاروں، کاریگروں اور مزدوروں کی

بستیاں آباد ہو گئیں۔ تو ذکر بار کر لینے والے چھوٹے چھوٹے جنگی جہازوں، منجیقوں اور دبابوں کی مصری کاریگروں نے مرمت اور تخلیق شروع کر دی۔ لٹخ اور آتش گیر مادے کے ذخیرے جمع ہونے لگے۔ لوٹ میں آئے ہوئے جنگی سامان کا بازار لگ گیا اور حکومت کے گماشتے منہ مانگی قیمت پر خریدنے لگے۔ آرمیڈائے خرد میں مامور ایوبی امراء راستوں کی ہمواری اور حفاظت اور رسد کی فراہمی میں مصروف ہو گئے۔

زرفشاں کے کنارے اونچے سطح میدان پر مدور بلند ہنر بارگاہ نصب تھی۔ سراپردہ خاص پر چاندی کی ڈانڈ میں آسمان سے باتیں کرتا ہوا وہ جھنڈا لہرا رہا تھا جس کے پھریرے پراٹا ہوا شیر اسد الدین شیرکوہ کے کارناموں کی یاد دل رہا تھا۔ داغیے پر چاندی کے قد آدم شمع دانوں میں رات کی ادھ جلی شمعیں اور بجھی ہوئی مشعلیں کھڑی تھیں۔ سامنے کر دیپدلوں کا دستہ زر کار لباس پہنے، مرصع قبضوں کی دمشقی تلواریں لگائے، داہنے ہاتھوں میں ٹھوس چاندی کے عصا لے پاسانی کر رہا تھا۔ ان کے قریب ہی کسے ہوئے عربی گھوڑوں کی قطاریں صبح کی خوشگوار دھوپ میں جگمگا رہی تھیں۔ اندر کھجور کی چھال سے بھرے ہوئے چری گدوں پر ریشمیں قالینوں کا فرش تھا۔ تلکار تھلیں دیواروں پر جگہ جگہ چھوٹے بڑے نقشے لٹک رہے تھے۔ وسط کی مسند پر ملک العادل دزیردوں اور امیروں کے حلقے میں گھرے بیٹھے تھے۔ ان کی پشت کی دیوار پر جہازی نقشے میں آسٹریا کے صلیبیوں کا راستہ سرخ روشنائی سے رنگا ہوا دور سے نظر آ رہا تھا۔ سامنے افسر الشرحہ اور افسر البرید کے کاغذات ڈھیر تھے۔ ایک ایک لفظ پڑھ کر وہ احکام بول رہے تھے اور ایک زانو پر بیٹھا ہوا کاتب لکھ رہا تھا۔ کاتب کے پہلو میں وزارت جہاد کا مستند صالح دوزانو بیٹھا تھا۔ ملک العادل نے اس کی طرف دیکھ کر حکم دیا۔

والیوں اور مالک محروسہ کے امیروں کے نام جو فرامین مہر شای کے لئے دارالحکومت بھیجے گئے تھے وہ پیش کر دو۔

”وہ ابھی تک وزیر جہاد نے واپس نہیں بھیجے۔“
”کیا!“

انہوں نے ہاتھ سے وہ قلم رکھ دیا جس پر سفید عقاب کا پر لگا تھا اور چہرے پر فکر کا سایہ کانپنے لگا۔

پھر سراپردہ خاص کا طلسمیں پردہ ہلا اور قصر سلطانی کا مہتمم علی سفاح سلام کر کے مؤدب کھڑا ہو گیا۔
”بیٹھ جاؤ۔“

نائب السلطنت نے یہ حکم دیا اور بیمار خیالوں کی دنیا سے نکل آئے۔

”میں تجلیے میں حضور عالی سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔“

جب بارگاہ خالی ہو گئی تب سفاح نے زبان کھولی۔

”کل صبح حاجیوں کے استقبال کے لئے سلطان السلاطین سوار ہوئے۔ بازار زردوزی سے نکلتے ہی بارش ہونے لگی۔ امیر جلوس نے چاہا کہ مدرسہ ایوبی کے سامنے سواری روک لے لیکن حکم نہیں ملا۔ سارا جسم شرابور ہو گیا۔ واپسی پر تیز بخار تھا۔ تہجد کے وقت سے غافل ہیں۔ فجر کی نماز قضا ہو گئی۔ فی الحال یہ راز چند قدیم نمک خواروں تک محدود ہے لیکن۔۔۔۔۔“

اس سے زیادہ سننے کی تاب نہ تھی۔ کھڑے ہو گئے۔ تالی بجائی۔ حاضر ہونے والے غلام کو حکم دیا۔

”پہ سالار کو طلب کرو اور گھوڑے لگاؤ۔“

جتنی دیر تک وہ تقی الدین سے سرگوشیاں کرتے رہے اتنے وقفے میں ذاتی رسالے کے سوار اور گھوڑے تیار ہو گئے۔ سوار ہوتے وقت جاں نثاروں نے ایک زبان ہو کر سبب پوچھا۔ پوری طمانیت اور بشاشت کے ساتھ جواب دیا۔

”حکم سلطانی۔“

ذہن راستہ بھراڑتے ہوئے گھوڑوں کی رفتار سے تیز کام کرتا رہا۔ انہوں نے ٹھنڈے منجھے ہوئے کار آزمودہ مدر کی ذہین آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھ لیا جو پیش آ سکتا تھا اور اس کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیا۔ ہمیشہ کی طرح باب الداخلہ پر گھوڑے سے اتر پڑے۔ دستور کے مطابق سلطان السلاطین کے ذاتی علم کو تدار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر تعظیم دی۔

درختوں، پھولوں اور جانوروں کے پاس سے ٹپکتے ہوئے گزرے۔ خدمت گزاروں اور غلاموں سے چھوٹے موٹے سوال کئے، معمولی معمولی باتوں پر حکم احکام دیئے اور قبہ سلطانی کی سیڑھیوں تک آگئے۔ نور الدین صاحبِ کیفا اور عماد الدین امیر ماردین وغیرہ کے سلام لئے، چہرے پڑھے اور سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ ایک منحوس اور سیہ پوش خاموشی طاری تھی۔ سارا قبہ شاہی شہزادوں، وزیروں، طبیبوں اور عالموں سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن پیشانیوں کی شکنوں، ابروؤں اور آنکھوں کی جنبشوں کے سوا زندگی کے کوئی آثار نہ تھے۔ سلطان ایوان میں اپنے تخت پر لیٹے تھے۔ ملک الاطہان کی بلند پیشانی پر دواؤں کا لپ کر رہے تھے۔ انھوں نے شہزادہ افضل اور شہزادہ ظاہر کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور گھٹنوں پر گر کر دست مبارک کو تھام لیا۔ طبیب خاص نے اشاروں ہی اشاروں میں پوری کیفیت بیان کر دی۔ پھر نائب السلطنت کے حکم سے باب الداخلہ کا پہرہ سخت کر دیا گیا۔ نہ کوئی اندر آ سکتا تھا اور نہ باہر جا سکتا تھا۔

اچھی خبروں کے اشتہارات دیئے جاتے ہیں، طبل بجائے جاتے ہیں اور اعلان کئے جاتے ہیں لیکن وہ اذیل ٹوؤں کی طرح قدم قدم پر دھرتا دے کر بیٹھ جاتی ہیں اور ہلائے نہیں بلتی مگر بڑی خبریں اپنے خداداد پروں سے اڑتی ہیں اور ایک خدائی کے بچھائے ہوئے جال سے صاف نکل جاتی ہیں۔ تین دن گزر چکے تھے، سلطان غافل تھے اور دمشق کو معلوم تھا۔ بازاروں، ڈیوڑھیوں، جاموں اور دیوان خانوں میں متفکر آوازیں صرف ایک ذکر کر رہی تھیں اور وہ سلطان کی بیماری کا ذکر تھا۔ اس دن جمعہ تھا اور باب سیاست کے لئے امتحان۔ سلطان المسلمین جامعہ دمشق میں نماز جمعہ ادا کرتے تھے۔ حسب معمول قبہ شاہی کی سیڑھیوں کے نیچے ”طاؤس زریں“ لگا دیا گیا تھا۔ حسب معمول غلی منزل میں اراکین سلطنت اور امراء دولت مرصع پر چھائیوں کی طرح خاموش کھڑے تھے۔ اذان ہوتے ہی زینے کے سیمیں دروازے سے ملک العادل اور ان کے پیچھے شہزادہ عزیز نمودار ہوئے۔ امیروں کے وسط میں کھڑے ہو کر عادل نے عزیز کو اپنے پاس بلایا۔ نکلنے قد، چہرے جسم اور کھلتی رنگت کا سو گوار شہزادہ سامنے کھڑا تھا۔ متورم پپوٹوں کے نیچے سُرخ آنکھیں غم سے گھلی تھیں۔ ناک کی پھنگی سُرخ تھی۔ کئی دن کی ترشی ہوئی سیاہ نکلی اور ہلکی

داڑھی کے بال ادھر ادھر نکلے ہوئے تھے۔ عادل نے عزیز کے شانوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے اور دلگیر مگر فیصلہ کن آواز میں بولے۔

”خدا ہمارے سروں پر ابد الابد تک سلطان المسلمین کا سایہ قائم رکھے لیکن اگر قیامت صغریٰ کا ہمارے سروں پر ٹوٹ پڑنا مقدر ہو چکا ہے تو تمہارے سامنے خم ہونے والا پہلا سر ملک العادل کا ہوگا۔ تمہارے حقوق کی حفاظت کے لئے علم ہونے والی پہلی تلوار ملک العادل کے نیام سے نکلے گی۔“

”لیکن۔“

”میں نائب السلطنت ہوں شہزادہ بزرگ۔ ایویوں کی عظیم الشان سلطنت کے مستقبل کا فیصلہ عورتوں کی رقیق القلب جذباتیت کے ہاتھوں میں نہیں دیا جا سکتا۔ سلطان نہ کسی کا بچپا ہوتا ہے نہ بھتیجہ۔ سلطان صرف سلطان ہوتا ہے۔ جاؤ پر آگندہ دل اسلامیوں کی امامت کرو اور سلطان معظم کی صحت کی دعا مانگو۔“

ان کی آواز سے آنسو ٹپکتے لگے۔ اپنے علمائے کے شملے سے آنکھیں پونچھیں پھر اپنے ہاتھوں سے شہزادے کا طربوش اتار لیا اور غلام کے ہاتھوں سے زرِ عمامہ لے کر باندھ دیا۔ ”طاؤس زریں“ کی رکاب میں پاؤں رکھتے وقت شہزادہ کانپ اٹھا۔

قصر شاہی کے باغوں اور میدانوں سے نکلتے ہی شامیوں کے غول نظر آنے لگے تھے جو ویران آنکھوں سے ”طاؤس زریں“ پر سوار عزیز کو دیکھ رہے تھے اور سرگوشیاں کر رہے تھے اور آسمان کی طرح ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگ رہے تھے۔ مدرسہ ایوبی کے سامنے زبردست ہجوم تھا۔ یہ مدرسہ سلطان کی دینی خدمات کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ یہاں دنیائے اسلام کے جید عالم اور بے بدل فاضل درس دیتے تھے اور کونے کونے سے کھینچ کر آئے ہوئے طالب علم شاہی خرچ پر علم حاصل کرتے تھے۔ سلطان کا دستور تھا کہ وہ ہمیشہ اس مدرسے کے دروازے پر اترتے تھے۔ عالموں اور طالب علموں سے مصافحہ کرتے، ان کی ضرورتیں سنتے اور رفع کرتے۔ آج سلطان کے گھوڑے پر سلطان کے بیٹے کو دیکھ کر ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

اب جامعہ دمشق ان کے سامنے تھا۔ جامعہ دمشق جس کی تعمیر کے مصارف میں ملک شام کے سات برس کے خراج کے علاوہ جزیرہ قبرص سے لائے ہوئے سونے چاندی

کے اٹھارہ جہاز بھی شامل تھے۔ اس کے فرش کا کاشانی کام ایران و ہندوستان اور بیزنطینہ کے کاریگروں کے کام کا اعلیٰ ترین نمونہ خیال کیا جاتا تھا۔ شہزادہ وسطی محراب سے گزر کر اس حجرے کے سامنے آگیا جس کے اندر وہ گھڑی تھی اور جہاں سلطان المسلمین وضو کیا کرتے تھے۔ شہزادے نے وہیں بیٹھ کر وضو کیا اور اس جگہ کھڑا ہو گیا جہاں کھڑے ہو کر سلطان نماز پڑھا کرتے تھے۔ اس کے نیت باندھتے ہی ساری مسجد میں ہولناک سناٹا چھا گیا۔ دور اندیش لوگوں کی دور بین آنکھوں نے مصیبت کے اٹھتے ہوئے سیلاب کو دیکھ لیا اور ردیے اور قاضی القضاۃ نے جب خطبے میں صلاح الدین کا نام لیا تو ہزاروں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھ گئے۔ ہزاروں زبانوں نے صحت کی دعا مانگی۔ نماز کے بعد ممبر پر کھڑے ہوئے امام نے طیلان قضا کے دامن پھیلا کر دعا مانگی۔

”پروردگار! اس امت کے نیکوں کی نیکیوں کے صدقے میں سلطان المسلمین کو صحت دے۔ بارالہ! بیت المقدس کی بازیابی کے تصدیق میں سلطان معظم کی عمر مبارک میں برکت دے۔“ رب العالمین! یہ شوکت و صولت جو تو نے اپنی امت کو سلطان اعظم کی تلوار کے واسطے سے عطا کی ہے اس کے طفیل میں سلطان اعظم پر رحم کر۔“ اے گناہوں کے بخشش والے! ہمارے جوان بیٹوں کی عمریں کاٹ لے اور حافظ اسلام کی زندگی میں پیوند لگا دے۔“ ان کی آواز زندہ گئی۔ وہ ممبر پر کھڑے کانپتے رہے اور روتے رہے۔ آمین کے نعرے لگتا ہوا ایک لاکھ نمازی فریادیں کرنے لگے اور آہ و بکا کے شور سے عبدالملک کی تاریخی مسجد کے در و دیوار لرزنے لگے۔

دوسرے دن شام ہوتے ہوتے سلطان نے آنکھیں کھولیں۔ تبسم فرمایا۔ اٹھنے کی کوشش کی۔ غلاموں نے پشت سے تکیے لگا دیے۔ نماز کا وقت پوچھا۔ تیم کرائے جانے کا حکم دیا۔ مغرب کی نماز ادا کی۔ طبیب خاص نے بچہ کے پانی کا بیالہ پیش کیا۔ خوب سیر ہو کر پیا۔ پھر اتنا پسینہ نکلا کہ لباس تبدیل کرنا پڑا اور عشاء کے وقت سارے دمشق میں صحت کی خبر آگئی۔ شکرانے کی نمازوں سے ایک ایک مسجد بھر گئی۔ صبح جب خاندان شاہی کی خواتین چلی گئیں اور شاہی طبیب شہزادوں کے ساتھ نبض دیکھنے حاضر ہوا تو آداب شاہی کی بجا آوری کے بعد تمام درجے کھلا دیے۔ باب الداخلہ پر عیادت کو آئی ہوئی آبادی کا ہجوم

تھا۔ در بچوں کا کھلنا دیکھ کر ان کی دعاؤں کا حجم بڑھ گیا۔ انتہائی نقاہت کے باوجود شور کا سبب دریافت کیا۔ شہزادے خاموش کھڑے رہے۔ ملک العادل نے جو چاندی کے تکیے دار تپائی کے مانند ایک کرسی پر بیٹھے سلطان کا ہاتھ دبا رہے تھے عرض کیا۔

”دمشق کے علماء، شرفاء اور صلحا عیادت سلطانی کو حاضر ہوئے ہیں۔“

سلطان نے سینے سے داہنا ہاتھ اٹھا کر تخت کے قالین پر ڈال دیا اور کمزور نگاہوں سے عادل کو دیکھا اور الفاظ توڑ توڑ کر بولے۔

”ہمیں نیچے لے چلو۔“

سلطانی طبیب سر ہانے سے چل کر پائنتی آگئے اور ہاتھ باندھ کر گزارش کی۔

”نیچے تشریف لے جانا سلطان المسلمین کی صحت کے لئے مضر ہے۔“

جواب ملا۔

”لیکن اخلاق کے لئے مناسب ہے۔“

تھوڑی دیر طبیب اور عادل ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

پھر ایک نیکے دار ایوان لایا گیا۔ سلطان دوسروں کی مدد سے اس پر دراز ہو گئے۔ غلاموں نے پوری احتیاط کے ساتھ اسے اٹھالیا۔ قبہ سلطانی کی چٹائی منزل کے جنوبی والاں میں دیوان لگا دیا گیا۔ حریری پردے باندھ دیے گئے۔ سنگین قد آدم کرسی سے باب الداخلہ تک مسلح سوار اس طرح کھڑے ہو گئے کہ آنے والے ایک طرف سے آئیں، نیچے ہی سے دیدار حاصل کر لیں اور دوسری طرف سے چلے جائیں۔ جب سب انتظامات مکمل ہو گئے نائب السلطنت نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ سفید، سیاہ، ہنر اور دھاری دار کفتانوں، بختیوں، عباؤں، چادروں، عماموں اور ازاروں کا خاموش دریا چڑھ آیا۔ سنگ سیاہ کے قد آدم چبوترے پر زرد دستونوں کے درمیان اور مظاہر عربی محراب کے نیچے چاندی کا دیوان رکھا تھا۔ سلطان اونچے تکیوں سے پشت لگائے دونوں ہاتھ مسند پر ڈالے لیٹے تھے۔ کان کے پاس زرد عمامے سے نکلے ہوئے کھڑی بال چمک رہے تھے۔ نیم خفتہ سی آنکھیں خلا میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ اونچی ستواں ناک کے نیچے ہمیں ہونٹ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کانپ اٹھتے، چمپی رنگ زرد ہو گئی تھی۔ نیچے خود ملک العادل کھڑے عیادت کرنے والوں کو پر جوش بد نظمی کو سنبھالے

ہوئے تھے۔ پھر غفلت طاری ہوگئی۔ داخلہ مسدود کر دیا گیا اور حکم ہوا قصر دمشق کے تمام میدانوں اور باغوں کے سلسلوں پر پہرہ کھڑا کر دیا جائے تاکہ باب الداخلہ تک کسی کی رسائی نہ ہو سکے۔

دو شہنشاہ کی رات کو قصر دمشق کے پہلو میں بنی ہوئی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھ کر طیب شاہی اٹھنے لگا تو عادل نے اس کا بازو پکڑ کر بٹھالیا اور دل سوزی سے بولے۔

”مجھے بتاؤ میرے بھائی کا کیا حال ہے؟..... اب میرے پیروں کے نیچے کی زمین ہلنے لگی ہے۔“

”عالم الغیب تو صرف ایک ہی ذات ہے نائب السلطنت۔ غلام اپنے علم اور تجربے کی بنا پر صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہے کہ کل تک انشاء اللہ ہوش آئے گا اور اگر کل کا دن ٹل گیا تو عالم اسلام کے سر پر منزل لاتی ہوئی قیامت ٹل گئی۔“

”آج کی رات۔“

”کیا..... آج کی رات۔“

”آج کی رات بھاری ہے نائب السلطنت۔ مدتوں کی بے انتہا تکان نے جسم کی قوت سلب کر لی ہے۔ جسم دواؤں کا اثر قبول نہیں کرتا۔ دمشق میں موجود تمام بڑے طبیبوں کا غلام نے مشورہ لیا ہے۔ نسخہ میں لکھتا ہوں لیکن تجویز طبی دنیا کے وہ عالم اور عامل کرتے ہیں جن کا ثانی زمین اور آسمان کے درمیان موجود نہیں ہے۔“

قبہ سلطانی کے نیچے میدان میں سپہ سالار تقی الدین سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق کھڑا تھا۔ ان کو دیکھتے ہی آگے بڑھا۔ کفتان کے دامن کو بوسہ دیا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔ عادل نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ میڑھیوں کے محافظ سوار اور پیادے ہٹ گئے۔ تقی الدین نے آہستہ سے کہا۔

”حکم کی تعمیل ہو چکی۔ ممالک محروسہ کے امیروں، والیوں اور سرداروں کو فرامین روانہ کئے جا چکے ہیں کہ سب اپنے مقام پر موجود رہیں۔ افواج آراستہ رکھیں اور حکم ثانی کا انتظار کریں۔ جو امراء دار الحکومت کی طرف حرکت کر چکے ہیں وہ یہ فرمان دیکھتے ہی

واپس ہو جائیں اور اپنے حدود کے انتظام و انصرام پر گرفت مضبوط رکھیں۔

عادل نے صرف گردن ہلائی اور آگے بڑھنے لگے۔ تقی الدین نے پوچھا۔

”زرخشاں کے کنارے مقیم افواج کے لئے کیا حکم ہے۔“

عادل نے بائیں طرف ایک قدم پیچھے چلتے ہوئے تقی الدین کو گردن گھما کر دیکھا۔

”کمر بندی اور انتظار۔“

پھر یک لخت وہ کھڑے ہو گئے۔ مرمریں راستے کے دونوں طرف زرد نگار شمع دانوں کی ان گنت کافوری شمعوں کی سفید ٹھنڈی روشنی میں تقی الدین نے عادل کی عقابی نگاہ کو دیکھا اور آنکھیں جھکا لیں۔

”عرب اور عجم، مصر اور شام، سوڈان اور بربر، کردستان اور ترکمان سب کے نیاموں میں ایک دوسرے کی گردن کے لئے تلواریں تڑپ رہی ہیں۔ ایک سلطان المسلمین کا اقبال انھیں بے نیام ہونے سے باز رکھے ہوئے ہے۔ ان کی علالت کی خبر ساری دنیا میں پہنچ چکی ہے۔ سالہا سال سے بیمار انسان کی سنگین علالت امکا ناہ کے دروازے کھول دیتی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں تقی الدین کہ امراء سازشیں کر رہے ہیں، شیوخ منصوبے بنا رہے ہیں، تلواروں پر بازو رکھی جا رہی ہے اور گھوڑوں پر زین۔ حکم دو کہ اہم مقامات کی سرحدیں بند کر دی جائیں۔ شاہراہوں کی نگرانی شدید کر دی جائے۔ قلعہ دار ایک ایک لشکر کی کوسیت کر قلعہ بند ہو جائیں۔ چپے چپے پر جاسوسوں کا جال بچھا دیا جائے۔ قلمرو کے ایک ایک تابع توجہ آدمی کی نگرانی کی جائے۔ سفیروں اور یرغمالوں میں آئے ہوئے امیروں کی حرکت و عمل پر پابندی عائد کر دی جائے۔ اسن عامہ میں خلل ڈالنے والوں کی گردن اڑا دی جائے..... جاؤ رات چھوٹی ہے اور کام بڑا ہے۔

ابھی وہ میڑھیوں پر تھے کہ شہزادہ طغرل سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

”کیا خبر ہے؟“

”مصر کا امیر البحر یہ اطلاع لے کر در دولت پر حاضر ہوا ہے کہ توڑ کر بار کئے جانے والے دوسو جنگی جہازوں سے لدے ہوئے خیر آرمینیا کی سرحد کے قریب پہنچ رہے ہیں۔“

عادل نے تھوڑے تو قیوت کے بعد فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔

”فرمانروائے آرمینیا کو حکم پہنچاؤ کہ قافلے کے قیام کا انتظام اور حکم ثانی کا انتظار کرے۔“

ساری رات حکومت کے اہم دفاتر شمعوں کی مدھم روشنی میں ٹھناتے رہے، پرچھائیوں کی طرح انسان آتے جاتے رہے۔ ڈاک کے گھوڑے اور کبوتر زمین و آسمان پر ہوا کے مانند اڑتے رہے۔ برج سلطانی میں خانوادہ شاہی بیدار رہا، بے قرار رہا۔ اطباء مشورے کرتے رہے، نسخے لکھتے رہے، دوائیں بناتے رہے۔ علماء قرآن پاک کی تلاوت کرتے رہے، نفلیں پڑھتے رہے اور صحت کی دعائیں مانگتے رہے۔

سورج کی کرن پھوٹے ہی سلطان نے انگڑائی لی اور آنکھیں کھول دیں۔ تیسم فرمایا جس نے چہرے پر روشنی کر دی۔ بغیر کسی کا سہارا لئے تکیوں پر کہنیاں ٹیک کر نیم دراز ہو گئے، تیسم کیا۔ تھنا نماز ادا کی۔ سلام پھیر کر دیکھا تو عادل آداب شاہی ادا کر رہے تھے۔ اپنے پاس بلایا۔ ایک ہاتھ ان کے اور دوسرا شاہزادہ عزیز کے ہاتھ میں دے دیا۔ چاروں طرف سے برستی ہوئی صحت کی مبارکباد پر مسکراتے رہے۔ دوا سے بھرا ہوا لشعب کا پیالہ ان کے دست مبارک میں تھا کہ فرمانروائے کیفا نور الدین محراب کے قریب آکر آداب شاہی ادا کرنے لگا۔ عادل کا اشارہ پا کر وہ ان کے قریب گیا اور عادل کے کان پر منہ رکھ کر سرگوشیاں کرنے لگا۔ عادل کے چہرے پر شکستیں ریختے لگیں۔ پھر وہ نفی میں گردن ہلا کر سلطان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سلطان نے عادل سے پوچھا۔

”کیا ہے؟“

عادل نے قدرے تامل کے بعد عرض کیا۔

”روم کا اسقف جو اپنی کرامتوں کی وجہ سے ساری عیسائی دنیا میں مشہور ہے بیت المقدس کی زیارت کرتا ہوا دمشق آیا ہے اور دین چاہ کی حضوری کا خواستگار ہے لیکن طبیب خاص۔“

”قبول کی گئی۔“

عادل اپنا جملہ مکمل کئے بغیر کھڑے ہو گئے۔ طبیب اور عالم ایک دوسرے کا منہ

دیکھتے رہے۔

تھوڑی دیر میں شہزادے اور امراء اس طرح اپنے اپنے مرتبے کے مطابق کھڑے ہو گئے کہ دالان نے دربار کی صورت اختیار کر لی۔ خاص برداروں کا ایک پیدل دستہ اپنے زر کار لباس اور جڑاؤ ہتھیار پہنے آیا اور کمان کی طرح دالان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ مملوک شہسواروں کا ایک پہرا سر میں سیڑھیوں کے دونوں طرف دور تک پھیل گیا۔ باب الداخلہ سے قہ شاہی تک سنگین راستے پر دونوں طرف سوڈان کے مشہور نیزہ باز قائم ہو گئے۔ پھر ترکمانوں کے جلو میں پادریوں کا ایک گروہ طلوع ہوا۔ سب کے آگے آگے اسقف تھا۔ وہ سیاہ نفیس ریشم کے کٹنوں تک لمبے جپے پر دباغت کئے ہوئے سرخ چڑے کی پاپوش پہنے تھا۔ گلے میں بھاری چوبیس صلیب طوق کی مانند پڑی تھی۔ برف کی طرح سفید ریشمیں داڑھی دمشق کی خوشگوار ٹھنڈی ہوا سے لرز رہی تھی۔ دونوں شانوں پر گھنگھریالی کاکلیں پڑی تھیں۔ سفید ابروؤں، سفید پلکوں اور نیم وارڈن آنکھوں پر رہبانیت کا تقدس برس رہا تھا۔ خاص برداروں کی صف سے گزرتے ہی اسقف کی نگاہ سلطان پر پڑی۔ اس نے جوانوں کی سی پھرتی سے سینے پر صلیب بنائی اور بوڑھے گھٹنوں پر کھڑا ہو گیا۔ محراب میں کھڑے ہوئے عادل نے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ ہر چیز کا جائزہ لیتی ہوئی ہوشیار آنکھیں اب صرف بیمار سلطان پر مرکوز تھیں۔ وہ چاندی کے دو گن اونچے ایوان پر تکیوں کے سہارے نیم دراز تھے۔ نصف جسم پر زرد الوان پڑا تھا۔ زرد مخمل کی صدری سے کفتان کا گلو بند نظر آ رہا تھا۔ صدری کی چست آستینوں کے تنگ کف مشکئی مخمل کے تھے۔ پتی نوکدار داڑھی کے دونوں کنارے سیاہ تھے۔ طربوش کے نیچے کالے گنجان ابروؤں کے سائے میں نیم ہفتہ سی بیمار آنکھوں میں شہنشاہی کا جلال چمک رہا تھا۔ زردی مائل گندی سٹے ہوئے چہرے پر پسینے کے قطرے نظر آرہے تھے۔ مصوروں کے سے خوبصورت ہاتھ پہلوؤں میں پڑے تھے۔ سر ہانے کھڑے ہوئے دو حسین غلام بادشاہوں کا لباس پہنے مورچیل ہلا رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آیا اور ایوان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پھر گردن کو خم دے کر تین بار تعظیم دی۔ عادل نے مرضعہ کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے گھٹنوں تک سر جھکا کر سلام کیا۔ سارا دربار کھڑا تھا۔ وہ بھی کرسی کے نیچے کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ تقریر اور تعلیم کے عادی اسقف نے بولنا شروع کیا۔

”نائٹوں کے نائٹ اور بادشاہوں کے بادشاہ کو سلام کرتا ہوں اور ولی شکرگزاری

حکم کی محتاج ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ قضا و قدر کے معاملات خاکی انسانوں کے کوتاہ ہاتھوں سے پرے ہیں۔“

سلطان تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔ سارے دربار پر سناٹا چھا گیا۔ سانسوں کی آوازیں اس سکوت میں نکل نہ ہو سکتی تھیں۔ پھر اسی طرح خلا میں گھورتے ہوئے فرمایا۔

”ہم نے چاہا تھا کہ مسجد اقصیٰ کے کس ہمارے سامنے ہوں۔ محمدی پرچم کا مقدس سایہ ہمارے سر پر ہو، ہمارا کفن ہمارے خون سے گلی کار ہو چکا ہو۔ ہم گھوڑے پر سوار سرخ تلوار علم کے جنگِ سلطانی لڑ رہے ہوں۔ اس گھڑی جس گھڑی ہمارا سپہ سالار ہمیں فتح کی بشارت دے، ہم جان جانِ آفریں کو سپرد کر دیں اور شہید کہلائیں۔“

”ہوایہ کہ بیمار کسانوں اور نامراد چرواہوں کی طرح اس بستر مرگ پر ایڑیاں رگڑتے ہوئے ہم موت کا انتظار کر رہے ہیں۔“

”معلوم نہیں کہ وہ کون سی خطا سرزد ہوئی جس کی پاداش میں اس شخص کو یہ موت دی گئی جو چھبیس برس تک دشمن کی صفوں میں شہادت ڈھونڈتا پھرا ہو۔“

سلطان نے گردن گھمائی۔ اسقف کی مرعوب آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شہانہ جلال سے فرمایا۔

”جس یورپ کے پانچ بادشاہوں کی لاکھوں تلواریں ہماری ایک خواہش کو پورا نہ کر سکیں اس کے ایک بوڑھے پادری سے ہم کیا مانگیں۔“

”نائب السلطنت۔“

”دین چناہ۔“

”جب تک یہ سلطنت ایوبی کی حدود میں ہیں ہمارے مہمان ہیں۔“ اور سلطان نے اپنا دامن ہاتھ بڑھا دیا۔

رعبِ سلطانی سے بدحواس اسقف نے دونوں ہاتھوں سے دستِ مبارک کو تھام لیا۔ گھٹنوں پر گر کر بوسہ دیا۔ آنکھیں ملیں اور لرزتی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر اگلے قدموں واپس ہونے لگا۔

کا اظہار کرتا ہوں کہ مزاجِ شاہی کی ناسازی کے باوجود قدم بوسی کا شرف عطا ہوا۔

”شہنشاہ! ایک مدت سے آرزو تھی کہ دنیا کے اس سب سے بڑے شہنشاہ کا نیاز حاصل کروں جس کے ہاتھوں میں مسیح نے القدس کی حفاظت سونپ دی۔ مغرب میں مخلوں سے جھوپڑوں تک جس کے نام کے گیت گائے جاتے ہیں اور افسانے سنائے جاتے ہیں۔“

بوڑھا اسقف تھک گیا تھا۔ سستانے کے لئے رکا اور پھر بولا۔

”دشمن پہنچ کر علم ہوا کہ سلطان اعظم علیل ہیں اور بڑے بڑے امیر باریابی کی سعادت سے محروم ہیں۔ میں نے عبادت کی، سلطان اعظم کی صحت اور اپنی باریابی کی دعا مانگی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں دیدار سے مشرف ہوا یعنی ایک دعا پوری ہوئی اور امید ہے کہ دوسری بھی قبول ہوگی۔“

وہ آسمان کی طرف دونوں بوڑھے لائے ہاتھ اٹھائے دعا مانگتا رہا۔

”اگر سلطان اعظم سماعت فرما سکیں تو ایک گزارش گوش گزار کروں۔“

”غلامِ راہب ہے۔ دنیا کی راحتوں اور کلفتوں سے بے نیاز لیکن جب بھی ”القدس“ کی زیارت کو آیا ہوں یورپ کے کسی نہ کسی فرمانروا کے لئے ایک دعا مانگی ہے اور مہدی مسیح کی برکت کے صدے میں پوری ہوئی ہے۔ اس بار سفر کی نیت کرتے وقت عہد کیا تھا کہ یرشلیم کے رحیم فاتح کے حضور میں حاضری دوں گا۔ اس کی ایک آرزو معلوم کرنے کی استدعا کروں گا اور قبولیت کے لئے مسیح سے رورود دعا مانگوں گا۔۔۔۔۔ اس لئے درخواست ہے کہ سلطان اعظم زبانِ مبارک سے ارشاد فرمائیں۔“

اسقف کے اس جملے نے پیشانی مبارک پر شکن ڈال دی۔ دونوں کہنیاں تکیوں پر ٹیک کر بیٹھ گئے۔ بڑے بڑے قاہر بادشاہوں کی فوجوں میں لچل ڈال دیئے والی آواز بلند ہوئی۔

”بوڑھے اور مسافر اسقف ہمارے دل نے کسی ایسی خواہش کو باریاب نہیں کیا جس کی تکمیل ہمارے حضور سے دستِ بستہ نہ گزری ہو۔ دنیا نے کوئی نعمت ابھی تک ایسی پیدا نہیں کی جو ہمارے غلاموں کی دسترس سے دور رہ سکی ہو۔ تاہم ان بیمار آنکھوں نے ایک خواب ایسا بھی دیکھا تھا جس کی تعبیر نصیب نہ ہو سکی۔ اس لئے کہ اس کی تعبیر قضا و قدر کے

پھر شخص کا حجم بڑھ گیا۔ وہ تکان سے نڈھال ہونے لگے۔ عادل دیوان شاہی کی طرف جھکے تو حکم ملا۔

”تکوار ہمارے پہلو میں رکھ دو اور تھکے کرو۔“

شاہزادہ عزیز نے دونوں ہاتھوں سے تکوار اٹھا کر دانے پہلو میں رکھ دی اور اگلے بیروں داہیں چلے گئے۔ چشم زدن میں تمام دروں کے جھلیں پردے کھل گئے۔ مشرقی محراب کا پردہ جب کھلنے لگا تو دست مبارک نے منع کر دیا۔ خلوت شاہی مکمل ہو گئی۔ صدری کی جیب سے انھوں نے ایلینور کا خط نکالا۔ گردن کا زاویہ بدل کر ہلکے زرد رنگ کے کاغذ کو اپنی آنکھوں کے سامنے کر لیا۔ کمزور جسم کی آنکھوں پر سیلی روشنی میں زور پڑا تو دھندلا گئیں۔ الفاظ کی صورتیں بگڑ گئیں۔ انھوں نے ایک ایک لفظ اپنی یادداشت کے سہارے پڑھ لیا۔ کانپتے ہاتھوں سے خط کو اس کے طول سے موڑا۔ تکوار کو بے نیام کیا۔ کاغذ کی لمبی پتلی سی چٹ کو نیام میں ڈال کر تکوار نیام کر دی۔ تالی بجانے کے لئے ہاتھ اٹھائے تو سامنے کا پردہ ہٹا کر ایلینور آ گئی۔ سر سے پاؤں تک بے شکن سیاہ لباس میں ملبوس، ننگے سر اور ننگے پاؤں اور صلیب بنا کر گھٹنوں پر گر گئی۔ سرخ بال سفید ہو گئے تھے۔ نیلی آنکھیں بے نور ہو چکی تھیں۔ چہرہ جھڑیوں سے لبریز تھا۔ ہاتھوں کی سفید کھال نے گوشت کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھے بیٹھی رہی۔ ان کے دل پر کسی نے تکوار کی انی رکھ دی۔ انھیں یاد آیا۔

وہ ارسوف کی پہاڑیوں پر مقیم اپنی بارگاہ میں بیٹھے صلیبیوں کی پیش قدمی کا انتظار کر رہے تھے۔ قاضی بہاء الدین قراہلوں کے پرچے پڑھ رہے تھے اور وہ سامنے رکھے ہوئے نقشے پر دشمن کی نقل و حرکت کے نشانات دیکھ رہے تھے کہ سرپردہ خاص کے دروازے پر کوئی بوڑھی عورت رونے لگی۔ فریادیں کرنے لگی جیسے پہرے دار اسے روک رہے ہوں اور وہ حضوری کے لئے گڑگڑا رہی ہو۔ وہ مظلوم بڑھاپے کی آفریاد سے بے قرار ہو گئے۔ حکم دیا کہ عورت کو سامنے لایا جائے۔ وہ میلا پھیلا سیاہ لباس پہنے تھی۔ زخمی پیروں سے خون رسی رہا تھا۔ شانوں پر سیلے کیلے سن کی موٹی پتلی رسیوں کی طرح بال جھول رہے تھے۔ شدید سردی میں خشک پتے کی طرح کانپ رہی تھی اور آنسوؤں نے اس کے چہرے کو بھگو دیا تھا۔ وہ آتے ہی آتے تخت کے سامنے اونٹنی گر پڑی اور در در و کر جم کی بھیک مانگنے لگی۔ اشارہ

کیا۔ اسے موٹے کمبلوں میں لپیٹ دیا گیا۔ انگلیٹھوں کے سامنے بٹھایا گیا۔ اونٹ کے گرم گرم دودھ کا پیالہ پیش کیا گیا۔ جب اس کے ہوش بجا ہوئے تو اس نے عرض کیا۔

”شہنشاہ! میرا ایک بیٹا ہے۔ دس ہیں نہ پانچ، دو ہیں نہ چار۔ وہ لوگوں کے بہلانے پھسلانے میں آ کر فوج میں بھرتی ہو گیا اور طبقہ الدادیہ کے سواروں کے ساتھ گرفتار ہو گیا۔“

”کہاں گرفتار ہوا؟“

قاضی بہاء الدین نے پوچھا۔

”عکہ پر، شہنشاہ! عکہ پر گرفتار ہو گیا۔ دو برس ہو رہے ہیں کہ چپے چپے کونا کونا ڈھونڈتی پھر رہی ہوں! آہ القدس پر رحمت کے بادل کی طرح برسنے والے مجھ بڑھیا پر رحم کر۔ عمر بھر دعائیں دوں گی۔“

اس سے زیادہ وہ نہ سن سکا۔ ناقابل بیان سردی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ فزغل پر طربوش پہن لیا اور تکوار اٹھالی اور بڑھیا کو اپنے ساتھ لے کر خیمے سے نکلا۔ امراء کو طلب کیا۔ قیدیوں کو حاضر کئے جانے کا حکم دیا اور بڑھیا اپنے بیٹے کو دیکھتے ہی چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی۔ دونوں کو ایک دن مہمان رکھ کر جوڑے اور گھوڑے عطا کئے۔ سفر خرچ دے کر رخصت کیا۔

”ہم کو اگر کسی عورت کے نصیب پر رشک آیا ہے تو یہی بڑھیا ہے۔۔۔۔۔ بادشاہوں کے بادشاہ۔“

ایلینور نے ان کے کان میں جھک کر عرض کیا۔

انھوں نے تکلیف سے کراہ کر روٹ لی۔

ایلینور آہستہ آہستہ آئی اور دیوان کے سامنے دوزانو بیٹھ گئی۔

”یوسف! اگر تمہاری تقدیر نے یاوری نہ کی ہوتی اور بادشاہوں کی بادشاہی نصیب نہ ہوتی اور تم صلیبیوں کے ہاتھوں غلام ہو گئے ہوتے اور رسیوں میں بندھے جانوروں کی طرح ہمارے حضور میں پیش کئے گئے ہوتے تو مسیح کی قسم ہم تمہارا ایسا استقبال کرتے کہ صدیوں تک تمہارا خاندان تمہارے نام پر فخر کرتا اور ہماری سخاوت کے افسانے سناتا۔ تبہین

کے ہمٹری نے تمہاری شان میں جو قصیدے گائے ہیں آج پہلی بار ان کی صحت میں شک پیدا ہوا۔“

”ہم بیمار ہیں ایلینور۔“

”بیمار؟ تم تو کہا کرتے تھے کہ جب ہم جہاد کے لئے گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں تو مرض گردن سے اتر کر ہماری رکاب تھام لیتا ہے۔“

”اگر تم کہو تو چڑکی رہائی کے لئے سفارت روانہ کر دیں۔“

”لیکن ایلینور! ہمیں یقین ہے کہ ہماری سفارت سے پہلے ہماری بیماری کی خبر پہنچ جائے گی اور شکست خوردہ بادشاہ سفیروں کو گرفتار کر لے گا اور اسلامیوں کی ہیبت کو نقصان پہنچے گا۔“

”اسلامیوں کی ذلت کے جھوٹے وہم پر ایک مجبور بوڑھی عورت کے جوان قیدی بیٹے کی جان اور آبرو کو قربان کر دینے والے نائٹ، ایلینور کا سلام لے۔“

اور وہ پردہ اٹھا کر باہر نکل گئی۔ انھوں نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز کو یا نہ رہا۔ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا، آنکھیں بند کر لیں اور حضوری قلب سے دعا مانگی۔

”پروردگار مجھے اس آزمائش سے نجات دے۔ اس امتحان میں سرخرو کر۔“

پھر انھیں محسوس ہوا جیسے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ انھوں نے اپنے پورے جسم کی قوت سمیٹ کر تائی بجائی اور نڈھال ہو کر ہاتھ چھوڑ دیئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ حکم کا انتظار کرتے ہوئے قدموں کی آواز سے دالان بھر گیا۔

ڈھلتے ہوئے جاڑوں کی کندنی دھوپ سنگ سیاہ کے چکیلے چبوترے پر پکھی تھی جیسے کفتانوں کے زرد اطلس کے بہت سے تھان کھول کر پھیلا دیئے گئے ہوں۔ آخر موسم کے دمشق گلابوں کی تیز خوشبو ٹھنڈی خوشگوار ہوا کے پہلو سے لگی تہ شاہی کے سامنے لرز رہی تھی۔ مشرق سے شمال تک پھیلا ہوا آئینی محرابوں کا جنگل شکاری چیتوں، عقابوں، بازوں، شکاریوں اور کبوتروں سے بھرا ہوا تھا۔ خدمت گزاروں کا انبوه بزرگماں اور قبائیں پہنے امیر و کار کے حکم کا منتظر کھڑا تھا۔

عمارت کے تمام مٹلی دروں کے پردے بندھے ہوئے تھے۔ عالموں کے ٹخنوں

تک لمبی قبائیں اور بھاری عماموں کے کمر تک لٹکتے شعلے تھمیلیں پاؤش اور امیروں کے زرکار کفتانوں، زرکار طربوش، کاہدار چری موزے، مریض نیا موم اور قبضوں کے آبدار ہتھیار سب خوابوں کی طرح خاموشی سے آرہے تھے اور میز ہیوں سے چبوترے کے گوشوں تک اور محرابوں کے قلب تک اپنے اپنے منصب اور مقام کے مطابق ایستادہ ہوتے جاتے تھے۔ افسردہ چہروں، مغموم آنکھوں، لرزاتے ہاتھ بیروں پر ایک غم تھا جو مسلط تھا۔ جب کہیں تل رکھنے کی جگہ رہی اور حواس پر قابو ہوا تو غلاموں کا سہارا لے کر سلطان المسلمین اٹھے اور تکیوں سے پشت لگائی۔ شہزادہ عزیز نے اپنے فراخ سینے سے سر مبارک کو سہارا دیا۔ دربار پر نگاہ کی۔ اپنے ہاتھوں سے پیدا کی ہوئی عظیم الشان سلطنت کے اپنی رکاب میں تربیت کئے ہوئے جلیل الشان امیروں اور وزیروں پر نظر پڑی تو کیسی کیسی یادیں تازہ ہو گئیں۔ کیسے کیسے خوئیں معر کے فتح کی مبارک باد دیتے سامنے سے گزر گئے۔ کیسی کیسی یادگار اور تاریخ ساز فتوحات سلام کرنے کو باریاب ہوئیں۔ آستین پر لگے ہوئے زرد زوال سے آنکھیں خشک کیں۔ ازلی گردن فرازوں اور رشتہ جی مغرور بادشاہوں کو سرنگوں کر ڈالنے والی آواز میں فرمایا۔

”لوگو! ہم نے تم کو طلب کیا اس اعلان کے لئے کہ ہمارے تم پر جو حقوق ہیں وہ معاف ہو گئے۔ اگر ہم پر تمہارے کچھ حقوق باقی ہیں تو ہم تسلیم کرتے ہیں۔ اور وصیت کرتے ہیں کہ ہمارے بھائی، بیٹے اور بھتیجے اس شفقت اور رحمت کے صلے میں جو ہم نے ہمیشہ ان پر روا رکھی ہے۔ ہمارے سامنے یا ہمارے بعد تم کو ادا کر دیں۔“

”ہم نے خدا کی رحمت سے ایک سلطنت پیدا کی اور سلطان کہلائے۔ لیکن درحقیقت ہم خدا کی امانت اور تمہاری خدمت کے امین تھے۔ آج یہ امانت اپنے پروردگار کو سونپتے ہیں اور وصیت کرتے ہیں کہ ہم اپنی طرف سے کسی کو اس سلطنت کا وارث قرار نہیں دیتے۔ جس پر تمہیں اتفاق ہوا ہے بادشاہ بنالو۔“

”دین پناہ۔“

ایک دردناک آواز بلند ہوئی۔ ملک العادل نے اپنی کمر سے وہ تلوار کھولی جو سلطان اعظم نے اپنے ہاتھوں سے حطین کی فتح پر باندھی تھی اور سلطان کے قدموں میں رکھ دی اور غلاموں کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوئے اور ردی ہوئی آواز میں بولے۔

آسان ہو جائے گی۔

”ہماری تلوار ہماری قبر میں رکھ دی جائے۔“

”قیامت کے دن جب خدا مجھ سے حساب مانگے گا تو جواب دوں گا کہ اے پروردگار! وہ ہے کے اس ٹکڑے کے صدقے میں جس نے بیت المقدس فتح کیا اور تیرے محبوب کی امت کے حوالے کر دیا، میرے بے حساب گناہوں سے درگزر کر۔“

”یقین ہے کہ اس وسیلے سے بخشش نصیب ہو جائے گی۔“

”وصیت ہے کہ جنازے کے ساتھ کوئی بین نہیں کرے گا۔“

”کسی خطیب کو تقریر کی اجازت نہیں دی جائے گی۔“

”کسی شاعر کو مرثیہ پڑھنے کا حکم نہ ہوگا۔“

”قبر پر تپکی اور پکی بنائی جائے۔“

ہونٹ کانپ کر رہ گئے اور تکیوں پر سر ڈال دیا۔ طبیب خاص نے لپک کر نبض پر

الٹکیاں رکھ دیں۔ آنکھیں کھولیں اور صاف الفاظ میں فرمایا۔

”دوا نہیں دعا کرو..... کلام الہی سناؤ۔“

بنو امیہ اور بنو عباس کے جاہ و جلال سے چشمک کرنے والے شہنشاہ کا آخری

دربار کھڑا تھا۔ باب الداخلہ پر سارا دمشق ”محافظ اسلام“ کا دیدار حاصل کرنے کے لئے

ٹھائیں مادر با تھا اور سینکڑوں ترسکائوں کے نیزوں کی نوک پر ٹھہرا ہوا تھا۔

ملک العادل کے حکم پر مقربین بارگاہ کے علاوہ تمام درباریوں کو قصر کے پچھلے

دروازے ”باب الشمس“ سے گزار دیا گیا۔ ایک بار سلطان کی آنکھ کھلی تو دیکھا جیسے سامنے

مخبطان کھڑا ہے۔

”مخبطان!“

دھندلی دھندلی سوگوار صورت میں سر سے پاؤں تک کا سہ گدائی بنا ہوا ایک لفظ

ایک حکم کی بھیک مانگ رہا ہے۔ ایک حکم جو کتنے ہی ملکوں کو تباہ کر ڈالنے والی لڑائی کے جہنم

روشن کر سکتا تھا۔ وہ کزور نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔ پھر ہاتھ کے اشارے سے قریب

آنے کا حکم دیا۔ بلکیں چھپکا کر پوری آنکھیں کھول کر دیکھا تو مفتی اعظم سامنے کھڑے تھے اور

”اب میں سلطنت ایوبی کا نائب السلطنت نہیں ہوں سلطان المسلمین! اس عظیم

المرتبت انسان کا بھائی ہوں جس نے مجھے باپ کی طرح پالا اور بیٹوں کی طرح برتا ہے۔“

”دین پناہ! خدا نہ کرے کہ ہماری زندگی میں ہم پر قیامت صغریٰ برپا ہو لیکن اگر

لوح محفوظ میں یہی مرقوم ہے تو جس طرح عادل نے آپ کی رکاب میں تلوار ہلانے کو زندگی

کی سب سے بڑی سعادت جانا ہے، آپ کے علم کی شوکت کے لئے سر تھیلی پر رکھ کر داد

شجاعت دی ہے۔ اسی طرح رب العالمین کی قسم اسی طرح آپ کے جانشین کے لئے.....

شاہزادہ عزیز کے لئے تلوار ہلاتا رہے گا۔ ان کی ایک جنبش ابرو پر اپنی اور اپنی اولاد کی جان

نچھادر کر دے گا۔“

اور سلطان کے ہاتھ پر اپنی نم آنکھیں رکھ دیں۔ سلطان کا دست شفقت ان کے

طربوش پر لرزتا رہا۔ آنکھوں سے دوا نسوز ہلک کر نورانی داڑھی میں کھو گئے۔ حاضرین زمین

پر آنکھیں گاڑے تصویروں کی مانند کھڑے تھے۔ ہاتھ ہلا کر قاضی القضاۃ کو اپنے قریب بلایا۔

قدموں میں رکھی ہوئی تلوار کی طرف اشارہ کر کے حکم دیا۔

”یہ دمشق کی حفاظت ہے..... اور صرف عادل کو زیب دیتی ہے۔“

قاضی القضاۃ نے دونوں ہاتھوں سے تلوار اٹھائی۔ ملک العادل سے کھڑے

ہونے کی گزارش کی اور تلوار کمر سے باندھ دی۔

”مفتی اعظم! یہ انگشتی نشان حکومت ہے۔ جس کا خطبہ پڑھا جائے اسی کے

ہاتھ میں پہنا دی جائے۔“

سلطان نے اپنے ہاتھ سے ”جبل نور“ سے آراستہ انگٹھی اتار دی۔ قاضی القضاۃ

نے دونوں ہتھیلیوں کی کشتی میں سنبھال لیا اور ہاتھوں کو سینے تک بلند کئے کھڑے رہے۔

”دمشق کا خزانہ..... شاید دنیا کا سب سے بڑا خزانہ ہے، جو ہم پر حرام ہے۔

ہماری ذاتی ملکیت میں سات درہم ہیں جو ہمارے سفر آخرت میں کام آئیں گے۔“

”سلطان المسلمین!“

”حطین کی لڑائی میں ہم نے جو کفن پہنا تھا۔ جسے بہن کریم بیت المقدس میں

داخل ہوئے تھے اسی خون آلود کفن میں ہم کو دفن کیا جائے کہ اس کی برکت سے قبر کی مصیبت

تلاوت کر رہے تھے۔ ان کے سر سے بوجھل گیا اور قرآن پاک کی آیتوں کے دریائے معانی میں ڈوب گئے۔ جب قاضی القضاۃ نے آیت کریمہ کے الفاظ لا الہ الاہو ادا کئے تو اپنی زبان سے بھی یہ مبارک الفاظ دوہرائے۔ جب قاضی اعظم نے علیہ توکلت پڑھا تو تبسم فرمایا۔ چہرہ یک بیک منور ہو گیا اور جان جان آفریں کو سوپ دی۔ (اِنَّا لِلّٰہُ وَاِنَّا اِلَیْہِ راجِعون)

دفعۂ زمین و آسمان منقلب ہو گئے۔ غلاموں، خواجہ سراؤں، محبوب کردوں، ترکمانوں، منظور نظر سوڈانیوں اور بدوؤں، مقرب بارگاہ شامیوں اور مصریوں اور عزیز از جان مملوکوں کی بے پناہ آہ وزاری کنگرہ فلک سے گرانے لگی۔ کئی گھڑی دن باقی تھا لیکن سورج سیاہ پوش بادلوں میں منہ چھپا کر پڑ رہا۔ منہ کڑک اور بھیاں گرج کی زبان میں اعلان تھا کہ آج دنیا پر آسمان سے نازل ہونے والی تمام رحمتیں اٹھالی گئیں۔ صحت کی خبر سے سرور دمشق پرکتہ چھا گیا جیسے کسی بوڑھے باپ کا تاج پوش اقبال مند بیٹا باتیں کرتے کرتے مر جائے اور وہ ہوش و حواس کھو دے۔ خود اطباء شامی اپنی پوری خنک مزاحیہ اور آزمودہ کاری کے باوجود صحت سلطانی کو درست خیال کر رہے تھے۔ ان کے علم اور تجربے کے مطابق خطرے کی گھڑی ٹل چکی تھی۔ ان کے نسخے اطمینان بخش نتائج دے رہے تھے۔ وصیت کے لئے طلب کئے ہوئے دربار کو وہ سلطان المسلمین کی انتہائی دین داری اور سیاسی بصیرت پر محمول کر رہے تھے، سلطان کے اچانک آنکھیں بند کر لینے سے بدحواس ہو گئے اور عامیوں کی طرح ایک دوسرے سے رحلت کا سبب دریافت کرنے لگے۔ سارا دمشق گھر میں بند ہو کر بیٹھ رہا۔ ایک ایک مکان اور ایک ایک دکان کے دروازوں کی طرح بند تھے۔ سڑکوں پر طاعون چل گیا تھا۔ بڑے بڑے امیر جن کے جلوں کے ساتھ دس دس ہزار گھوڑے چلتے تھے اپنے زمان خانوں میں مصلے بچھائے بیٹھے تھے اور حفظ اماں کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ بغداد، تونسہ اور آرمینیا کے سفیر اور ممالک محروسہ کے نمائندے سیاہ لباس اور خالی نیام پہنے باب الداخلہ کی بیرونی محرابوں میں ننگے سر کھڑے نائب السلطنت کے حکم کا انتظار کر رہے تھے اور فرامین لے جانے والے سیاہ کبوتروں اور سیاہ گھوڑوں کی اڑان و رفتار دیکھ رہے تھے۔

بادشاہ مرتے نہیں۔ جب ایک تھک کر رہ جاتا ہے یا سو جاتا ہے تو دوسرا اس کے

زندہ یا مردہ جسم کو تخت سے گھسیٹ کر پھینک دیتا ہے اور خود قبضہ کر لیتا ہے لیکن جب کوئی ایسا عظیم انسان اس جہان سے اٹھتا ہے جس کی موت سے شفقت، محبت، صداقت، شرافت، سخاوت، علم و فضل اور عدل و انصاف کے ادارے مر جاتے ہیں تو شہر روتے ہیں اور ملک سیاہ پوش ہو جاتے ہیں۔ کھیتوں سے شادابی اور منڈیوں سے برکت اٹھ جاتی ہے۔ دلوں سے پھوٹنے والی مسرت معدوم ہو جاتی ہے اور نفاق کی فصول کو سیراب کرنے والے زہریلے شہات اور اندیشوں کی آسمان سے بارش ہوتی ہے اور تاریخ کے صفحات اس کی مدت، اس کی قوم کے کارناموں کے ذکر سے مدت تک، صدیوں تک، قرون تک خالی رہتے ہیں۔ صلاح الدین کی موت ایسے ہی ایک انسان کی موت تھی۔ اس موت نے صدیوں کے بعد بازیاب کئے ہوئے اداروں کو قرونوں تک کے لئے کھودیا۔ چھتناہر برگد کے گھنے، ٹھنڈے اور محفوظ سائے میں بیٹھی ہوئی امت اس زلزلے سے بلبلا اٹھی جس کی ہلچل ایشیا سے یورپ تک یکساں محسوس کی گئی۔

اس وقت جب کہ اندوہ ناک آوازوں سے قصر دمشق کے ایوان لرز رہے تھے، آنسوؤں سے زمین نم تھی اور آہوں سے آسمان سیاہ تھا اور اکین سلطنت نے اندر سے ٹوٹے ہوئے نائب السلطنت کو مشورہ دیا کہ سلطان المسلمین کی عاشق رعایا غم سے پاگل ہو چکی ہے اور اس کو تلواریں ہی سے سنبھالا جاسکتا ہے جو آئین سیاست کے خلاف ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ قصر شامی کے خانہ باغ میں آخری رسوم ادا کر دی جائیں۔ عادل نے تامل کے بعد اثبات میں گردن ہلا دی۔

ان گنت انسانوں نے آنسوؤں سے وضو کیا، بچکیوں سے تکبیریں کہیں اور باب الداخلہ میں رکھے ہوئے جنازے کی نماز پڑھی۔ وسیع و عریض خانہ باغ خوشبودار مشعلوں اور کافوری شمعوں کی سیاہ روشنی سے سیاہ پوش تھا اور پہلی بار مختصر معلوم ہو رہا تھا۔ کہیں کھڑے ہونے کی جگہ نہ تھی۔ جب ملک العادل نے قبر میں میت اتار دی تب ملک العزیز ان مملوکوں کی صف سے نکلے جو خاص سلطان المسلمین کی رکاب میں تربیت پائے ہوئے تھے اور جن کی اولاد کے نام یہ شرف لکھا گیا تھا کہ نصف صدی بعد چنگیز کی فاتح عالم فوجوں کو پامال کریں اور قاہر مغلوں کی مغرور گردنوں سے قاہرہ کی گلیاں بھر دیں۔ شاہزادہ افضل کے

دونوں ہاتھوں پر رکھی ہوئی وہ تلوار اٹھائی جو چھبیس برس تک سلطان اعظم کے پہلو سے لگی رہی تھی۔ جس نے چھبیس برس تک اسلامیوں کی حفاظت کی تھی، جس سے ساری دنیا کی عیسائی تلواروں نے پناہ مانگی تھی، جس نے ایک صدی سے کھوئے ہوئے سنگین صحیفے کو بازیاب کیا تھا۔ سادے فولادی ہلائی قبضے کو بوسہ دیا، زرد چمڑے کے نیاز کو ادب سے پکڑا اور آخری زیارت کے لئے علم کر دیا۔ آنسوؤں سے دھندلی آنکھوں کے سامنے کاغذ کی ایک لمبی پتلی چٹ نیام سے گر پڑی۔ ملک العزیز اسی طرح تلوار علم کئے ہوئے آگے بڑھے اور اس کے آقا کے پہلو میں لٹا دیا۔ کاغذ کا وہ پرزہ جو یورپ کی تاریخ میں ایک نیا باب کھولنے کے لئے مشتق آیا تھا، علم قدموں کے نیچے کچل کر مر گیا جیسے قومیں تاریخ کے قدموں سے کچل کر مر جاتی ہیں۔

☆☆☆